۷۸٦ ھوالکل یامعین

خواجہ حسن نظامی

کی

چٹکیاں اور گدگدیاں

مذہبی ہنسی۔ تمدنی ہنسی۔ علمی اور ادبی ہنسی

اردو زبان میں مہذب ظرافت کی سب سے پہلی کتاب

مصنفہ

سیدی حضرت خواجہ حسن نظامی

جسکو پیرزادہ سید محمد صادق کارکن حلقۃ المشائخ عرب سرائے دہلی نے

ملا محمد الواحدی صاحب کے

درویش پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا

ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ — قیمت ۸/ — فروری ۱۹۱۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نئی دل لگی

کتاب جس کا نام چٹکیاں اور گدگدیاں ہے۔ نئے اردو کے لطیفوں کا مجموعہ ہے ظرافت ہر بڑی
مشہور زبان کا لازمی اور ضروری حصہ ہے۔ قوموں کی زندگی زبان سے ہوتی ہے۔ اور زبان کی
زندگی میں جہاں علوم و فنون کا بڑا حصہ مددگار ہوتا ہے۔ وہاں بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی بھی اس کی
جان سمجھی جاتی ہے۔ اسلام نے ایسی ظرافت کی اجازت دی ہے جس میں جھوٹ اور فحش و بتمیزی
کی باتیں نہ ہوں۔ کسی خاص شخص کی دل آزاری نہ ہوتی ہو۔ رسول خدا صلعم کی مبارک زندگی
میں اس قسم کی جائز ظرافت کی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں۔

مشہور واقعہ ہے جس کو سب مسلمان جانتے ہیں۔ کہ ایک دن پیغمبر خدا صلعم اپنے اصحابؓ
کے ساتھ بیٹھے کھجوریں نوش فرما رہے تھے۔ دستر خوان پر حضرت علیؓ بھی تھے پیغمبر خدا کھجوریں
کھا کر گٹھلیاں حضرت علیؓ کے آگے رکھتے جاتے تھے۔ جب کھانے سے فراغت ہوئی۔ تو

آنحضرتؐ نے فرمایا جس کے آگے گٹھلیاں زیادہ ہوں۔ اس نے کھجوریں زیادہ کھائی ہوں گی
حضرت علیؓ نے جواب دیا۔ نہیں جس کے آگے گٹھلیاں نہ ہوں اس نے زیادہ کھائی ہونگی کیونکہ
وہ گٹھلیوں سمیت کھجوریں کھا گیا۔

یہ معاشرت کی ظرافت تھی۔ اور باوجود اس ادب و احترام کے جو رسولؐ خدا کا حضرت
علیؓ کرتے تھے۔ انھوں نے ہنسی کی گفتگو میں لطیف اعتراض کا لطیف و بے بلا کا نہ جواب دیا
مذہبی معاملات میں بھی آنحضرتؐ کی ظرافت کبھی کبھی ہوا کرتی تھی۔ مگر اسمیں جھوٹ اور
بیہودگی کا ذرا دخل نہ تھا۔ ایک دفعہ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ کوئی بوڑھی عورت بہشت میں نہ جائیگی
اس پر بڑھیا عورتوں کو بڑا فکر ہوا۔ اور وہ آزردہ ہونے لگیں۔ تو آنحضرتؐ نے سمجھایا۔ کہ جنت میں
سب لوگ خواہ عورت خواہ مرد جوان ہو کر داخل ہونگے، چاہے وہ مرتے وقت بچے ہوں
چاہے جوان ہوں۔ چاہے بوڑھے ہوں، بہشت میں داخلہ کے وقت خدا سب کو جوان بنادیگا
آنحضرتؐ کا یہ فرمانا خوش طبعی تھی۔ کہ بڑھیا عورتیں بہشت میں نہ جائینگی۔

اسلامی خلفا اور بادشاہوں کے ہاں بھی مہذب مذاق و ظرافت کا عموماً چرچہ رہتا
تھا۔ عرب کے ظریف شاعروں کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ فارس کے خوش طبع لوگ بھی شاہی
درباروں میں بہت عزت و قدر سے رکھے جاتے تھے۔

آج کل یورپ کے مہذب ملکوں اور قوموں نے تو ظرافت کو بھی ایک فن بنا دیا ہے
چند سال ہوئے امریکہ کا مشہور مسخرا مارک ٹوئین۔ لندن میں آیا۔ تو سارے انگلستان نے آؤ
آؤ بھگت کی۔ اور خود بادشاہ نے اس کو اپنے پاس بلایا۔ اور اس کی باتیں سنیں۔ مارک ٹوئین
کے لطیفے اردو زبان میں بھی چھپتے تھے۔ مگر ہم اہل مشرق کی نظر میں اس امریکن ظریف کی باتوں
میں کوئی خاص لطافت نہ تھی۔

ہندوستان میں مغل پٹھان بادشاہوں اور امیروں کے دربار ظریفوں سے
بھرے رہتے تھے۔ اور وہ تفریحی اوقات میں ان لوگوں سے بات چیت کر کے دلوں کو

...یا کرتے تھے۔

اردو زبان کا رواج ہوا۔ تو سب سے پہلے اسمیں ریختی کی نظمیں زیادہ کہی جاتی تھیں
...اردو کی غزل کو ہی اس زمانہ میں ریختی کہا جاتا تھا۔
یہ نظمیں عموماً عورتوں کی زبان میں اور مذاقیہ ہوتی تھیں۔ دو ایک شاعر مثلاً میاں انشاء جب
...چرکین تو اس ریختی ظرافت میں شہرہ آفاق ہو گئے تھے۔ اور اس قدر عفت بڑھے تھے۔ کہ
...ان کا کلام بہ سبب غلیظ و فحش ہونے کے شائع ہونا سرکار نے بند کر دیا ہے۔
اردو کے دور اول میں نثر و نظم کی ظرافت بہت جلدی ہزل و بیہودگی میں گر پڑی۔
...۔ اس واسطے اس کو کچھہ ترقی نہ ہوئی۔ اور اعلی طبقوں کی شرافت و سنجیدگی نے بازاریوں
...اس کو پھینک دیا۔
جب انگریزی حکومت چلی۔ اور یورپ کے نئے خیالات اردو میں سمانے لگے تو ظریفانہ
...جاری ہوئے جن میں لکھنؤ کے اودھ پنچ نے خوب دھاک بھائی اور ملک کے بڑے
...نامور انشا پردازوں نے اپنی شوخ نویسی کے جوہر اسمیں دکھلائے۔ یہ ظرافت،
...، معاشرتی۔ اور قوم و ملک کے سیاسی معاملات میں دکھائی جاتی تھی۔ مگر اس کا لطف
...یافتہ اور اونچے درجہ والے اخبار بیں لوگوں تک محدود تھا۔ عوام اور متوسط درجہ
...گ اکبر و بیربر کے لطیفوں سے جی بہلایا کرتے تھے۔ یا جان و چرکین کی نظموں کے چرچوں
...بنتے تھے۔

جوں جوں تعلیم بڑھی اور اردو زبان میں شائستگی آئی۔ ظرافت کا رنگ بھی بدلنے
...اور قدرت نے ایک عجیب شان کا زندہ دل شاعر اردو میں پیدا کیا۔ یہ خان بہادر مولانا
...سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی ہیں۔ جن کو "لسان العصر" کے نام سے لوگ یاد کرتے

جناب اکبر اول اول اودھ پنچ کے لطائف نویسوں میں دھوم مچا چکے تھے۔ اور بلند

صحبتوں میں ان کا غلغلہ پڑ چکا تھا۔ اخباروں اور رسالوں کی کثرت ہوئی تو عوام میں بھی لئے اشعار برسنے لگے۔

انصاف یہ ہے۔ کہ ستھری سنجیدہ اور دل میں چٹکیاں لینے والی اور پھر ہر اعتبار سے کام کی ظرافت کی داغ بیل حضرت اکبر کے قلم نے اردو ادب میں ڈالی ہے۔ لئے بعد جو اس میدان میں آیا۔ انہی کی پکی سڑک پہ دوڑا۔ اکبر کا کمال نہ کسی کو نصیب ہوا۔ نہ میسر آنا ممکن ہے۔ کیونکہ وہ غیب سے ایسی طاقت و قدرت لائے ہیں۔ کہ جس کے دل میں چٹکی لیتے ہیں، وہ بجائے آہ کرنے کے واہ کرتا ہے۔

انکی چھیڑ زیادہ تر نئے فیشن کے کردار گفتار۔ رفتار کے ساتھ ہوتی ہے۔ اور وہ اس چھیڑ سے اپنے اصلی تمدن کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ جو باعتبار ایک مشرقی بزرگ ہونے کے ان کا فرض ہے۔ کہ اپنی قدیمی سوسائٹی کی روایتوں کو سنبھالے رکھیں۔

انہوں نے خیالات مذہب اور اس کی بری تبدیلیوں پر اس کثرت سے چٹکیاں لی ہیں کہ عقائد مذہب سے پھسلنے والوں کا دل ہی جانتا ہوگا۔

ایسا ہی معاشرت کی نیرنگیوں کے ہر چھوٹے بڑے رجحان کو چٹکی اور گدگدی سے خالی نہیں چھوڑا۔ انکی تحریر سے سیاست و پالیٹکس میں دخل دینے کا ارادہ نہیں پایا جاتا۔ مگر چونکہ وہ ان نوجوانوں یا اہل زمانہ کے چٹکیاں لیتے ہیں اور ان عقائد و خیالات کے گدگدیاں کرتے ہیں۔ جو سیاست و پالیٹکس میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس واسطے عام طور سے سمجھا جاتا ہے۔ کہ اکبر بھی سیاسی اشارے کرتے ہیں۔ مگر حقیقت اور اصلیت اس کے سراسر خلاف ہے۔

میری طبیعت کی اُفتاد

شوخی و ظرافت کے خلاف واقع ہوئی ہے۔ میں زیادہ تر غم و درد کے مضامین میں اپنے دل کو مائل پاتا ہوں۔ اور جن لوگوں کو میرے گذشتہ ایام کے مضامین یاد ہونگے۔ وہ گواہی

دے سکتے ہیں۔ کہ اردو ادب میں میری شناسائی بیان درد تک محدود تھی اور اب بھی

جسقدر جی کا بہاؤ دکھ کی جانب ہے۔ سکھ کیطرف نہیں ہے۔

مگر جناب اکبر کی ہم نشینی اور کچھ اس احساس کے سبب کہ نثر اردو میں مفید ظرافت

کا رواج بڑھے مجھ کو بھی شوق ہوا۔ کہ آورد سے اس میدان میں طبع آزمائی کروں۔ غم و سوز

کی باتوں پر ... ... میں آمد سے لکھتا تھا۔ ہنسی مذاق کے

لئے آورد کی ضرورت پڑی۔ اور چند اخباروں میں اس پیرایہ پر آزمائشی قلم فرسائی کی۔

پہلے ظرافت کے لئے مختلف عنوان اخباروں میں ہوتے تھے۔ کوئی مذاق کے ماتحت

لکھتا۔ کوئی لطائف و ظرائف کی سرخی قائم کرتا۔ کوئی غپ شپ۔ کوئی کچھ۔ کوئی کچھ۔ میری

عادت تقلید کی نہیں ہے۔ اس واسطے میں نے آورد ہی سے اس کا عنوان نیا تصنیف

کیا۔ اور اس کا نام چٹکیاں اور گدگدیاں رکھا۔

اب تک ان عنوانوں سے خلقت کی طبیعتیں مانوس نہیں ہوئی ہیں۔ اور ان کے

ذیل میں جو ظریفانہ مضامین لکھے جاتے ہیں۔ ان کو سنجیدہ تصور کر لیا جاتا ہے۔ چنانچہ

لکھنؤ کے اخبار ہمدم میں میں نے ایک ظریفانہ نوٹ "چراغ گل کردو" کے عنوان سے

لکھا تھا۔ اور اوپر گدگدیاں بھی لکھوا دیا تھا۔ اسپر بھی غلط فہمی ہوئی۔ اور لوگوں نے

اس کو سنجیدہ مضمون سمجھ لیا۔ معمولی آدمیوں نے نہیں۔ بی۔ اے پاس اخبار نویس

نے اسپر نکتہ چینی کی۔ اور میں نے عشق کا جو مذاقیہ علاج بتایا تھا۔ اسپر اپنے روزانہ اخبار

میں ایک لیڈر کے ماتحت جرح و قدح کی اور اس کے بعد اسی صوبہ کے متعدد اخبارات

مجھ پر برس پڑے۔

مجھے ان لوگوں کی غلط فہمی سے وہی لطف آیا۔ جو جنت سے ممنوع بڑھیوں کے

گھبرانے سے آنحضرت صلعم کے وقت میں مسلمانوں کو آیا ہوگا۔

یہ تو اخبارات کی غلط فہمی ہوئی حکام سلطنت کی خوش فہمی ملاحظہ فرمائیے

اخبار خطیب میں ایک ہنسی کا چٹکلہ بعنوان "پیاری ڈکار" لکھا تھا۔ اور اس میں آج کل کے شورش کن ترش نویس لوگوں کے لہجہ میں خود ان سخت زبانوں کا مضحکہ اڑانے کی نیت سے۔ جو خواہ مخواہ حکومت کو اپنی زباں درازی سے دق کیا کرتے ہیں۔ ڈکار کی آزادی کا مطالبہ کیا تھا۔ آسانی سے سمجھ میں آسکتا تھا۔ کہ اس مضمون کا مقصد نئے فیشن کے اس خیال کی ہنسی اڑانا ہے۔ کہ وہ ڈکار لینے کو برا سمجھتے ہیں، اور اس مضحکہ کو دانستہ انہی دشمنان ڈکار کے انداز گفتگو میں لکھا تھا۔ کہ اگر ڈکار کو آزادی نہ ملی۔ تو میں باغیانہ تقریریں کرونگا۔ اور یہ ہوگا۔ اور وہ ہوگا۔

اس مضمون کا سی۔ آئی۔ ڈی۔ کے محکمہ نے ترجمہ کر کے گورنمنٹ میں پیش کیا۔ اس کو یہ غلط فہمی ہوئی۔ کہ شاید میرا ڈکار سے کچھ اور ناگفتنی مطلب ہے

مگر غنیمت ہے۔ کہ انگریز حکام کے کان مارک ٹوین کے فلسفہ ظرافت سے آشنا تھے۔ جو انہوں نے اس ترجمہ پر توجہ نہ کی۔

نثر ظریف

میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ نظم کی شوخ اور مفید وعلمی ظرافت کے بعد نثر میں سب سے بہتر ظرافت لکھنے والے مولوی محفوظ علی صاحب بی۔ اے ساکن بدایوں ہیں۔ ان سے زیادہ نیچرل اور بے ساختہ چلبلی اور از سرتاپا مرصع ظرافت کوئی نہیں لکھتا یا میرے علم میں نہیں ہے۔

اخبار ہمدرد میں تجاہل عامیانہ کے عنوان سے جو مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ اس میں زیادہ حصہ موصوف کا ہے۔ (وہ اس فاش گوئی اور راز گفتن سے برا نہ مانیں) ان کے بعد ببوق اور مسٹر شوکت علی کا نمبر ہے۔

مسٹر ظفر علی خاں زمیندار کو بھی مذاقیہ مضامین کا خاصا ملکہ ہے۔ مگر میں ان کو ایک دوسرے فن کے اعتبار سے اول درجہ دونگا۔ یعنی وہ کسی کی ہجو کرنے میں ایسا کمال

رکھتے ہیں جس کی مثال اُردو نویسوں میں سوائے مرزا حیرت کے اور کہیں نہیں ہے۔

اگرچہ میں مرزا حیرت کو فوقیت دیتا ہوں۔ کیونکہ وہ آسان اور نہایت میٹھی زبان میں ہجو کرتے ہیں۔ اور ظفر علی خاں ادق اور مشکل عبارت میں۔

میری ظرافت

جس کا نمونہ اس کتاب میں ہے درحقیقت ظرافت نہیں ہے۔ میں نے خود اقرار کیا ہے کہ یہ آورد ہے۔ اور لوگوں میں زندہ دلی اور لطیف نکتہ چینی کا شوق پیدا کرنے کو یہ طومار تیار کیا ہے۔

ناظرین کو اندازہ ہو جائے گا۔ کہ اکثر مضامین میں جناب اکبر کا پیرایہ میرے پیش نظر ہے۔ وہ نظم کے دو جملوں میں جو بات کہتے ہیں میں نے اس کو ایک بڑے مضمون نثر میں ادا کیا ہے۔

بعض مضامین کی شوخی کھلی ہوئی ہے۔ بعض کی عبارت اوپر کی سطح سے سنجیدہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر اثر دل پر ظرافت کا ہوتا ہے۔

دانستہ بھی ایسا کیا ہے۔ کہ بعض شوخ مضامین کو رکاکت میں گر جانے کے اندیشہ سے متانت کی چادر اُڑھا دی ہے۔

لکھتے لکھتے اب مجھ کو اتنی مشق ہو گئی ہے۔ کہ آورد کی غور کی ضرورت نہیں پڑتی اور میں بے تکان لکھتا چلا جاتا ہوں۔ اس سے نومشق جوانوں کو نتیجہ نکالنا چاہیئے۔ کہ مشق کرتے کرتے وہ بھی سب کچھ کر سکتے ہیں۔

ہماری قوم میں آج کل (شاید ہمیشہ) بڑا نقص یہ ہے۔ کہ خود کوئی بات ایجاد کرنے کا شوق نہیں رکھتے۔ دوسروں کی تقلید و پیروی کرتے ہیں۔

اب ہم لوگوں کے پاس زبان کے سوا کیا باقی رہا ہے۔ مگر اس میں بھی ترقی نہیں کرتے۔ اور چیزوں میں تو خیر دوسروں کی محتاجی۔ اور مفلسی کا شکوہ ہے۔ زبان میں کیا شئے مانع ہے

اگر ہر مضمون نگار اپنی تحریر میں کسی خاص جدت کا خیال رکھا کرے۔ تو خود اس کو بھی مزا آنے لگے گا۔ ایک نئی راہ بھی نکل آئیگی۔ اور اردو چند روز میں کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی

ہنسی مذاق میرا کام نہ تھا۔ مگر میں نے محض زبان اردو کی خاطر اس میں دخل دیا۔ اور کچھ لکھا۔ جو سامنے حاضر ہے۔ گو میں مانتا ہوں۔ کہ لطافت و ظرافت جس کا نام ہے۔ وہ ان مضامین میں نہیں ہے۔ تاہم بالکل نہ ہونے کے مقابلہ میں یہ کچھ ہونا بہتر تھا۔ اس واسطے نابود نہ رہنے دیا۔

میرے تازہ مجموعہ مضامین پر جو سیپارۂ دل کے نام سے گذشتہ مہینے شایع ہوا ہے۔ جناب مولوی عبدالحق صاحب بی اے سکرٹری انجمن ترقی اُردو نے دیباچہ لکھتے ہوئے۔ ایک فقرہ یہ بھی لکھا تھا۔ کہ ان مضامین میں غالب کیطرح ظرافت کی چاشنی نہیں ہے۔ لہذا آج میں مغلوب کیطرح ظرافت کی چاشنی چکھانے لایا ہوں۔

تقسیم ابواب

اس مختصر سے رسالے میں بڑا دیباچہ چھوٹے قد پہ بڑا عمامہ معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ۱۶ اکتوبر کی راجہ نواب کانفرنس میں پنجاب کے ایک راجہ صاحب پر ایک دلی والے نے پھبتی کہی تھی۔ کہ "اتنی سی بٹیا سوا گز کی چٹیا" کیونکہ ان کا قد بہت چھوٹا اور عمامہ بہت بڑا تھا۔

مگر میں درصل اس رسالہ پر دیباچہ نہیں لکھتا۔ بلکہ اپنی قوم کو زبان کیطرف توجہ دلانے کو یہ خامہ فرسائی اور طول کلامی کرتا ہوں۔ ابتدائی شوق کے مضمون نگاروں کو رستہ بتانا۔ اور انکی ہمت بڑھانا میرا مقصد ہے۔ اور انہی کے لیئے ان مضامین کو جمع کر کے ایک جگہ شایع کیا جاتا ہے۔

لکھتے وقت تو یہ بات مدنظر نہ تھی۔ مگر اب جمع کرتے وقت میں نے ان مضامین کو علیحدہ علیحدہ بابوں میں تقسیم کرنے کے قابل پایا۔ ایک باب مذہبی مقرر کیا۔ اور اس کے نیچے وہ مضامین جمع کیئے جنکا تعلق کسی مذہبی مسئلہ۔ خیال۔ یا عقیدے سے تھا۔ دوسرا

معاشرت کا رکھا۔ جس میں تمدن و زندگانی و رہنے سہنے کی باتوں پر جو جو بحث تھی وہ مضامین درج کئے گئے۔ تیسرا باب خالص اور محض ادب و انشاپردازی کا رکھا جس میں صرف الفاظ و عبارت کا لطف ہے۔ اور کچھ نہیں۔

مضمون لکھنے والوں کو مشورے

آخر میں انکی خدمت میں چند مشورے پیش کرنے چاہتا ہوں جنکو مضامین لکھنے کا ابتدائی شوق ہے۔ کہ وہ اس قسم کی سنجیدہ و مہذب ظرافت میں طبع آزمائی کرکے زبان کے اس حصہ کو اور کشادہ کریں لطیف اور ذومعنی عبارت کا انسان کے دل پر بہت اثر ہوا کرتا ہے ملک و قوم کے معاملات پر اس انداز سے مباحثہ کئے جائیں گے تو بے حس لوگوں کو خواہ مخواہ ان سے لگاؤ پیدا ہوگا۔

یورپ والوں نے کارٹون یعنی مضحکہ انگیز تصویروں کے ذریعہ بڑے بڑے کام ملک و قوم کے انجام دیئے ہیں۔ تمہارے ہاں تصویر ناجائز ہے۔ تم نے جس طرح فن مصوری کے مقابلہ میں فن خوشنویسی ایجاد کیا تھا۔ اسی طرح کارٹونوں کے بجائے تم نثر و نظم میں نہایت خوبی و اختصار کیساتھ ظریفانہ چٹکلے لکھا کرو۔ جو انسانی دل پر اور دماغ پر تصویر کا کام دیں۔

ایک بات اور ہے۔ جسکا خیال بہت کم کیا جاتا ہے۔ کہ لکھنے والے آسان اور عام فہم زبان نہیں لکھتے۔ عربی فارسی کے موٹے موٹے الفاظ عبارت میں ٹھونس دیتے ہیں۔ مگر وہ کیا کریں مجبور ہیں۔ ان کو عادت ہی ایسے مشکل مضامین لکھنے کی پڑ گئی ہے۔ لہذا میں ابتدائی مشق کرنے والوں کو یہ بتانا چاہتا ہوں۔ کہ وہ شروع ہی سے اس کا خیال رکھیں۔ کہ حتی المقدور مشکل الفاظ عبارت میں نہ آئیں۔ اور فقرے چھوٹے چھوٹے ہوں۔

ظرافت کے مضامین میں تو صاف الفاظ اور چھوٹے چھوٹے فقروں کی ازحد ضرورت ہے کیونکہ بغیر اس کے عوام اس سے متاثر نہیں ہو سکتے اور انہی کے متاثر کرنے اور سیدھے راستہ پر لانے کی ضرورت ہے۔

حسن نظامی

باب اوّل

امور مذہبی

جہادی شہید کا کفن

نکالا شیخ کو مجلس سے اس نے یہ کہکر   یہ بیوقوف ہے مرنیکا ذکر کرتا ہے۔

میں چودہویں صدی کا مسافر۔ گہر سے چلتا ہوں۔ تو ٹفن باسکٹ اور اخبار کا پرچہ سردی ہو تو ایک نفشین ایل کمبل ضرور ساتہہ رکہتا ہوں۔ گذشتہ صدیوں کے مسلمان سفر کو جاتے تہے تو حمائل قرآن شریف لوٹا۔ مسواک۔ اور کفن بہی ساتہہ لیتے تہے۔ کیونکہ ان کو عبادت اور موت کا گہر سے نکل کر بہی خیال رہتا تہا۔

یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ سامان سفر میرا اچہا ہے۔ یا ان کا اچہا ہوتا تہا۔ اس کا فیصلہ ہر شخص اپنے اپنے مذاق کے موافق کر سکتا ہے۔

البتہ کفن کی نسبت اتنا کہہ سکتا ہوں۔ کہ یہ بہت ہی ڈراونی چیز ہے۔ اس کو میں اپنی ڈریس روم میں بصورت فوٹو بہی نہیں دیکہنا چاہتا۔ عجیب بے ہنگم لباس ہے۔ اور لباس بہی اسوقت کا جس کا خیال کرنے سے قوت عقل کو صدمہ ہوتا ہے۔ اور خواہ مخواہ عیش و راحت میں ایکر کراہت ہونے لگتی ہے۔

سنتا ہوں مسلمانوں کے ہاں ایک حدیث آئی ہے۔ کہ جو شخص رات دن میں چالیس بار روزانہ موت کو یاد کر لیا کرے۔ تو اس کو شہید کا درجہ ملتا ہے۔ میرے فیملی ڈاکٹر کو اسکی خبر ہو جائے۔ کہ میں نے ایسی بات سننے کا ارادہ کیا ہے۔ تو وہ ضرور کلورا فارم لے کر دوڑا آئے۔ یا افیون کا ست پلائے۔ یا برانڈی کے چند قطرے حلق میں ٹپکائے۔ کیونکہ اس کو

میری صحت کا بڑا خیال رہتا ہے۔ اور وہ نہیں چاہتا۔ کہ ایسی وہمی چیزوں سے میرا دماغ پریشان ہو۔

میں اندنوں وسکی کا ایک گلاس زیادہ پینے لگا ہوں۔ کیونکہ کم بخت واہمہ لڑائی کی ڈراؤنی شکلیں سامنے لے آتا ہے۔ اور دل سے کہتا ہے۔ کہ سب آدمی مرجایا کرتے ہیں میرا دل ایسا واقع ہوا ہے۔ کہ وہ مرنے کے خیال میں فوراً جی لگا لیتا ہے۔ ہر چند اس کو ادھر سے ہٹاتا ہوں۔ مگر وہ میدان جنگ کے بے گور و کفن مردوں کے دیکھنے سے باز نہیں آتا۔ اور ٹھنڈے سانس بھر کے کہتا ہے۔ ایک دن سب کو اسی طرح مرنا ہوگا۔ میں نے بارہا اس سے پوچھا۔ کہ مجھ کو بھی؟ تو اس نے ذرا رعایت نہیں کی اور یہی کہا۔ ہاں تجھ کو بھی۔ اس لیے میں نے مجبوراً جام شراب سے اس کا منہ بند کیا۔ اور تھوڑی دیر کے لیے اس سے نجات حاصل کی۔

کل کی سنو! ایک مسلمان شہیدوں کے کفن کی نسبت بحث کر رہا تھا۔ میں نے چاہا۔ کہ سنی ان سنی کردوں۔ مگر اس نے کہا۔ آپ بھی تو مسلماں ہیں مجھے کچھ شرم سی آئی اور میں نے سائل کی رعایت سے الحمد للہ کہہ دیا۔

یہ لوگ بڑے بے تہذیب ہوتے ہیں۔ اتنا خیال نہ کیا۔ کہ میں نے کتنی بڑی جرأت کرکے اس کا دل ٹھنڈا کیا تھا۔ چاہیے تھا۔ کہ خاموش ہو جاتا۔ مگر وہ تو گلے کا ہار ہو گیا اور بولا شہیدوں کو کفن نہیں دیا جاتا۔ وہ اپنے ملبوس خون آلودہی میں بغیر غسل کے دفن ہوتے ہیں۔ خون ان کا غسل ہے۔ اور خون بھری پوشاک ان کا کفن دفن۔ کفن کا ہم وزن لفظ سنکر مجھے ایک پھریری سی آئی۔ اور دل کے اوپر سینہ کے پیچھے میں درد کی سی کسک معلوم ہوئی۔ میں ڈرا۔ کہ کہیں۔ ہارٹ فیل (دل کی حرکت بند) نہ ہو جائے۔ میں نے اپنا سگار جلایا اور اس سے بولا۔ کیوں صاحب کل کرکٹ کا میچ کیسا رہا۔ اس وحشی نے جواب دیا۔ آپ گیند بلے کو پوچھتے ہیں مجھے اس کی بابت کچھ معلوم نہیں۔ اتنا کہکر پھر شہید کے کفن کو لے

بیٹھا۔ کہ واہ کیسی اچھی موت ہے۔ مسلمان دولھا بن کر خدا کے سامنے جاتا ہے۔ سر کٹا ہوا۔ سینہ چھدا ہوا۔ مگر آنکھیں اپنے معبود کے آگے جھکی ہوئی۔

اب تو میرا دل لرزنے لگا۔ مجھ کو ایک جمائی آئی۔ اور بائیں حصہ جسم میں رعشہ کا سا اثر محسوس ہوا۔ میں نے اس سے کہا۔ کیا تم نے دیکھا میرا بایاں ہاتھ اور پاؤں کچھ کانپتا ہے۔ فالج تو نہیں ہے۔ اس نے ہنسکر جواب دیا۔ جی نہیں، وہم ہے! اور بالفرض فالج ہو بھی تو کیا ڈر ہے۔ ہم تو خدا رسول کی باتیں کر رہے ہیں۔ اس میں جو تکلیف ہو۔ ثواب میں لکھی جاتی ہے۔

یہ سنکر مجھ کو تاب نہ رہی اس کی دیدہ دلیری۔ اور بے ہراسی پر غصہ بھی آیا۔ اور ترس بھی۔ کہ یہ لوگ کسقدر کمزور عقیدہ رکھتے ہیں۔ اور زندگی جیسی پیاری چیز کی خاک قدر نہیں جانتے۔ اور میں نے اس کو ترشی سے یہ گفتگو بند کرنے کا حکم دیا۔

خیر ہوگئی۔ کہ ڈیرف درمبلٹن ادہر آنکلے۔ اور میں ان کے ہمراہ اٹھکر چلا آیا۔ تاہم جہادی شہید کا کفن رات بھر سر پر سوار رہا۔ اسی واسطے آج آٹھ بجے کے بدلے دس بجے بیدار ہوا ہوں۔

لب بام تکٹکی

ایک بزرگ نے حضرت معروف کرخی کو خواب میں دیکھا۔ کہ عرش اعظم پر ٹکٹکی جمائے کھڑے ہیں۔ اور "دید دیدار" میں مصروف ہیں۔

پوچھا یہ مرتبہ کیونکر ملا۔ کسی نے کہا۔ کہ انہوں نے عبادت بہشت کے لالچ اور دوزخ کے ڈر سے نہیں کی تھی۔ بلکہ حب الٰہی ان کا مقصود تھا۔ اس واسطے خدا تعالٰی نے یہ مقام دیدار بازی عطا فرمایا۔ میں اگر شاہدان بازاری کے کوٹھوں پر ٹکٹکی لگانے سے فرصت پاؤں تو عجب نہیں۔ میں بھی اس شاہد حقیقی کے بام تک پہنچ جاؤں۔ مگر ابھی تو مجھ کو اپنے

نو تعمیر مکان کی تیسری منزل کا خیال زیادہ رہتا ہے۔ زندگی میں اس کو بنا ہوا دیکھ لوں۔ آخرت کی خبر خدا جانے

کیا کروں دل آئی کہتا ہے۔ کہ زہد و عبادت میں بڑا ثواب ہے۔ مگر طبیعت ان باتوں میں نہیں لگتی۔ اور میرا جی کیونکر لگے جب پیرجی صاحب ہی کا ناٹک سے دل بہلتا ہے۔

بنگلہ خدا

پہلے ہم ایشیائی تھے۔ دیسی آدمی کہلاتے تھے، ہر چیز مشرقی اور دیسی وضع کی بناتے تھے مگر اب فضل نیچر سے، رتبہ مغربیت حاصل ہوا ہے۔ کالے ہیں، مگر چال ڈھال گوروں کی رکھتے ہیں۔ پہلے بوریہ پر یا پیال پر یا بان کی چارپائی پر سوتے تھے۔ اب اسپرنگ کے لچکدار پلنگ پر آرام کرتے ہیں۔ پہلے گھروں میں قالین تھے۔ چاندنیاں تھیں۔ گاؤ تکیے تھے، اب میزیں ہیں۔ کرسیاں ہیں۔ کوچیں اور بنچیں ہیں، پہلے جوتیاں فرش کے باہر اُتارتے تھے۔ اب جوتیوں سمیت فرش پر پھرتے ہیں۔ پہلے منہ دھو کر کرتہ کے دامن سے منہ پونچھتے تھے۔ اب بازار سے اجلے اجلے تولیے لاتے ہیں۔ پہلے بیسن اور کھلی سے ہاتھ دھوتے تھے۔ اب پیر کا صابن ہاتھ صاف کرتا ہے۔ پہلے غسل کے وقت پانی ہمارے اوپر آتا تھا۔ اب ہم پانی کے اوپر سوار ہوتے ہیں اور ٹب میں بیٹھ کر نہاتے ہیں۔

وہ وقت ہم کو یاد ہے۔ کہ ہمارے چہرہ پر لمبی لمبی گھانس خدا کا نور سمجھی جاتی تھی اب باغوں کی گھانس کترتے کترتے ہم نے اپنے چہروں کی گھانس کو بھی کترنا شروع کر دیا ہے۔ اور ڈاڑہی مونچھہ کو صاف کر کے ہمارے چہرے اصلی نورانی بن گئے ہیں۔

اس زمانہ میں سینہ کا چھوٹا سا دل خدا کا گھر سمجھا جاتا تھا۔ اور اُن دیکھا عرش اور کرسی ہم کو خوش کرتی تھی۔ اب بنگلوں کو خانہ خدا بنایا ہے۔ اور کرسی پر بیٹھ کر عرش و کرسی کے فرضی افسانے کو جی سے ہٹایا ہے۔ مگر دیکھو پرانے زمانے والے اکبر الہ آبادی ابتک پرانا

طعنہ دیئے جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ؎

خدا کا گھر نہ رکھا دل کو بنگلوں میں مکیں ہو کر
ہلایا عرش کو اس قوم نے کرسی نشیں ہو کر

وہ تو وہ " احمد آباد کے عبد الغفار صاحب لنگری شاہ بھی بولے، اور راندیر سورت کی فیشن ایبل مسجدوں کو دیکھ کر کہا۔ کہ یہ مسجدیں خانۂ خدا نہیں بنگلہ خدا ہیں۔

کیا غضب ہے اگلے زمانے والے ابتک جیئے جاتے ہیں۔ کل کوٹھی میں اذان کی آواز سنی گئی تھی۔ آج ان کی زبانی بنگلۂ خدا کا لفظ سنا۔

جب مسجدیں ایشیائی طریق پر بنتی تھیں۔ تو ان کو خانہ خدا کہتے تھے۔ اب ہمارے گھر خانہ نہیں رہے۔ فارسی کا لفظ ان سے اُٹھ گیا۔ تو مسجدیں بھی بنگلۂ خدا مشہور ہونی چاہئیں۔ ہم اس طعن سے چڑتے نہیں ہیں۔ دیکھو راندیر کی مسجدوں میں کیسا جی لگتا ہے سب ٹھاٹ ولایتی ہے۔ پرانے زمانہ کی بھدی میلی کچیلی مسجدوں میں جاتے تھے، تو حضور قلب نہ ہوتا تھا۔ اب ان مساجد کی چمک دمک اور مغربی اداؤں کی برکت سے دل اسیطرح جلدی خدا کے سامنے پہنچ جاتا ہے جسطرح مغربی ریل ہم کو گھنٹوں میں سینکڑوں میل پہنچا دیتی ہے۔ اور تار برقی منٹوں میں ہزاروں کوس ہماری خبریں لے جاتی ہے۔ تو کیا حرج ہے۔ اگر ان مسجدوں پر بنگلۂ خدا کی پھبتی کہی گئی۔

میں خاک پر وُہ ہوا پر

کل میں خدائے پاک کے آگے خاک پر سجدہ کر رہا تھا۔ اوپر سے ایک ہوائی جہاز گزرا۔ دل نے کہا۔ خدا کو مٹی میں نہ دیکھ۔ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر آسمان پر چل اور عرش کو جھانک

اسپر ہوائی جہاز نے پکارا۔ دیوانے فرعون نے بھی سوچا تھا۔ مگر آسمان تک نہ پہنچ سکا تو خاکی ہے۔ خاک ہی کے اندر خدا کا جلوہ نظر آئے گا۔ یہ فرعونیاں انہی لوگوں کے واسطے چھوڑ دے۔

خدا کی خاطر

ہم لوگوں نے ہزار سر مارا۔ کہ اس ان دیکھے خدا کی اسیری سے رہائی ہو۔ مگر خبر نہیں اس کو کیا جادو آتا ہے۔ اور اس نے انسانوں پر کیا پڑھ کر پھونک دیا ہے۔ کہ ہر آدمی اس کا دم بھرتا ہے۔ اور اس کی خوشی کی خاطر بڑی بڑی بلاؤں کو سہہ لیتا ہے۔

آج کل ہردوار میں کمبھ کا میلا ہے۔ سولہ سترہ لاکھ انسانوں کا جماؤ ہے۔ ریلوں میں انسان حیوانوں کیطرح بھرے جاتے ہیں۔ جسم و روح کو تحلیل کرنے والی تکلیفیں اٹھاتے ہیں۔ مگر خدا کے نام پر دریا میں ایک غوطہ مارنے کی خاطر گھر بار چھوڑ کر چاروں طرف سے امڈے چلے آتے ہیں۔ مناسب ہے کہ ایک بین الاقوام مشترکہ کانفرنس قایم کی جائے جس میں غور ہو۔ کہ خدا کا اثر کم کرنے میں ہم انسان کیا طرز عمل اختیار کریں۔ تا کہ ہمارے ہم جنس۔ اس رات دن کی کشمکش سے نجات پائیں۔

گنگا اور زمزم کے پانی میں آخر کیا بات ہے جو خلقت اس پر پلی پڑتی ہے۔ سوائے اس کے کچھ نہیں۔ کہ خدا نے ان پر کچھ سحر کر دیا ہے۔ اگرچہ جادو ٹونہ بھی خلاف عقل چیزیں ہیں۔ لیکن بطور سراغ رسانی و تفتیش تھوڑی دیر کے لیئے ہم ان کو تسلیم کیئے لیتے ہیں۔ اس کے بعد۔ تمام ملحدان یورپ کے منتخب آدمیوں کے ذریعہ کوئی نہ کوئی بات خدا کو زک دینے کی نکل ہی آئے گی۔

مگر ڈر یہ ہے۔ کہ کہیں وہ جس کو خدا کہتے ہیں۔ ہمارے ہی ہم قوم لوگوں کو ولی پیغمبر رشی۔ اوتار کے خطابات دے کر ہمارا مخالف نہ بنادے۔ کیونکہ خطاب پا کر آدمی برادری کے حقوق سے کچھ بے تعلق سا ہو جاتا ہے۔

میاں طاہر کی صراحی

مشہور گردن والی مورت آئی جی کو بھائی۔ واہ کیسی اچھی میاں طاہر کی صراحی
دلی و میرٹھ کی صراحی بہت نامور ہے۔ مگر اس بہاولپوری صراحی کی شکل نے سب کو مات
کیا۔ دیکھنا گردن ایسی ہوتی ہے۔ نہ دلی کی صراحی کی سی بھدی بدشکل۔ کہنے کو مٹی کی تصویر
ہے۔ مگر پیکر آدم کے عرفان کے لیے منزل حق کی لکیر ہے۔

وہ خود صراحی بن کر دنیا میں آیا۔ آپ معرفت اپنے اندر لایا۔ جام گردش میں آئے
پینے والے جھوم جھوم کر متوالے کہلائے۔ مگر اب تو دور ہی اور ہے۔ صراحی ٹوٹ گئی۔ پانی
بکھر گیا۔ جام خالی رہ گئے۔ پیاسے آب خوروں کی جگہ آب دہن میں آگئے۔ اب میں اس
صراحی کو لے کیا کروں۔ میاں طاہر آب طہور لاتے۔ شراب طہور ان کو ملی تھی۔ بہشت کی
رضوان نے روکا تھا۔ تو سوڈا واٹر کی دوکان تو موجود تھی ہیں تو نئی روشنی کا صوفی ہوں
جنت کی شراب کے بدلے سوڈا واٹر۔ جنجر واٹر۔ اور لیمونیڈ پیتا ہوں۔

اس صراحی کے نقش و نگار بھی خوب ہیں۔ اور بناوٹ سجاوٹ بھی مرغوب ہے۔
لیکن جب اس کے بنانے والوں کا خیال کرتا ہوں۔ جو بہاولپور کے احمد پور میں رہتے
ہیں۔ تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ کیسے بھدے ہاتھوں نے کیسی پیاری چیز بنائی ہے۔
اسی لیے تو کسی نے کہا۔ کہ نقاش کی صورت پر نہ جانا چاہیئے۔ اور حضرت مولے
علی نے فرمایا۔ کہ یہ دیکھ کہ کیا کہا۔ یہ مت دیکھ کہ کس نے کہا
میں اگر یہ دیکھتا۔ کہ صراحی کن ہاتھوں سے بنی۔ تو بہاولپوری پنجابیوں کے خیال سے
جی بیزار ہو جاتا۔ مگر میں نے اپنے آقا حضرت علی کے مقولہ پر عمل کیا۔ قول کو دیکھا۔ قائل پر نظر
نہ ڈالی۔ تو پھر میاں طاہر کی صراحی کا قصیدہ مدحیہ کیوں نہ پڑھوں۔ کہ دنیا میں اظہار شکر و
احسان لازمی ہے۔ اور میر اشکرانہ سارے جہان سے بیگانہ ہوا کرتا ہے۔

وہ نینی تال جاتے ہیں

میں نے نینی تال کا نام سنا۔ تو آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ کیسا کھاری تالاب تھا۔ اشجار پاک اسی تالاب سے سرسبز ہیں۔ صاحب میں وہاں کیا آؤں اشک بھرے دو نین نینی تال سے بڑھ کر ہیں۔ ان ہی میں ٹھنڈک ہے۔ ان ہی میں گرمی ہے۔

زمانہ کے سرد و گرم سے کیا سروکار۔ جب خود اپنے کوہ رخسار پر گنگا بہتی ہے۔ اور آہ شرربار دل کے بنگلے میں جاگزین ہے۔

آپ کو وہ ٹھنڈی ہوا مبارک۔ سنگین نشیب و فراز مبارک۔ پانی کے شور مبارک عیش و راحت کے روز مبارک۔ میں غریب نہ مرغی کا سوداگر ہوں نہ انڈے کا بیپاری نہ میرے ہاں ڈبل روٹی بکتی ہے۔ نہ مکھن تیار ہوتا ہے۔ پھر میں پہاڑ پر کس کے کام آسکتا ہوں۔ ہاں رونا دھونا منظور ہو تو دو چار آہیں۔ اس خط میں لپیٹ کر بھیجدوں۔ ان کو سینہ پر لگا لینا۔ خود ہائے ہائے کرنے لگوگے۔ میاں نینی تال میں رہتے ہوئے یہی خیال رکھنا۔ کہ ایک اور اونچے پہاڑ پر بھی جانا ہوگا۔ جہاں اعمال کی بہار ہوگی۔ یہ اچھے نہ ہوئے۔ تو سارے پہاڑی نمبر کرکرے ہو جائیں گے۔

من کہ ایک دھوبی

کاغذی گھاٹ پر

جاری جا۔ میں روٹی نہیں کھاتا۔ چاولوں کی پیچ ادھر کنارے پر رکھدے۔ اور ایک چلم بھر کر لا۔ چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو

کیوں ری ننوا کی ماں۔ دریا کا پانی گدلا۔ صابن کم۔ میں کیونکر ان میلے کپڑوں کو صاف کروں۔ چھوا چھو۔ چھوا چھو۔ چھوا چھو۔

دیکھہ درخت کا پتا سوکھہ کر گرا۔ ہوا اُڑا کر لے چلی۔ اب خبر نہیں یہ بچھڑا ہوا کب ملیگا

چھُوا چھو۔ چھوا چھو۔ چھوا چھو

میرا بیل ہاتھیوں سے بڑا۔ گھوڑوں سے تیز۔ ریل سے زیادہ تابعدار۔ پھر تو کہتی ہے۔ کہ امیر بڑے ہوتے ہیں۔ ان میں بڑائی میرے دم سے ہے۔ میں اجلے کپڑے نہ پہناؤں تو انکی دو کوڑی کی عزت ہو جائے۔

چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو،

بھر لے حقہ مار لوں گھونٹ

بیپتا چھائی چاروں کھونٹ

سنتی ہے۔ اس کا غذی گھاٹ پر آئی ہے۔ چُنری۔ پچولا۔ دھلوانے لائی ہے۔ تو میری بات مان پچولا سن کے صابن سے دہلے گا۔ جس کو پریم کی بھٹی میں چڑہاؤنگا۔ نیچے آگ جلاؤنگا۔ اور پھر یہ گاتا جاؤنگا۔

اُو ـــــــــــــ ہُو ـــــــــــــ اُو

کیوں رے چولے کاٹوں تیرا میل پانی اُبلا جوش میں آیا۔ تو گھبرایا۔ میل کٹا پاک ہوا صاف ہوا۔ اب کیسی سی۔ سی۔ آہ

اُو ـــــــــــــ ہو ـــــــــــــ اُو

چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو،

یہ تن۔ وہ من، تو دھوبن۔ میں دھوبی۔ سب ہیں ساجن۔ تو دھوبن میں دھوبی

چھوا چھو ، چھوا چھو ، چھوا چھو،

کہنے دے ہم کمین ہیں۔ ہم موٹے وہ مہین ہیں۔ دیکھتی نہیں سارے باریک میرے ہاتھہ میں ہیں۔ میں ان کو پتھر پر پچھاڑ رہا ہوں۔

چھوا چھو، چھوا چھو۔ چھوا چھو

یثرب نگر کے چودہری نے کہا۔ جو سارے سنسار کے میلے تنوں کو دہونے آیا تھا،
اسلام غریبوں سے شروع ہوا۔ اور پہر غریبوں میں آجائے گا، تو بس ہم تم دونو اپنے چودہری
کے بیان پر مگن ہیں۔ اسلام ہم میں ہم اسلام میں۔ اور سب امیر پیسہ والے من و تو کے
کلام میں چھو اچھو، چھو اچھو، چھو اچھو،

چھیو رام چھیو۔ چھیو۔

پکا پکو کرو ہیں دہریا۔ لے جا ری وہیں دہریا، تجہہ سے اتنا کہا۔ میں روٹی نہیں کہاتا
ان اور جل دو بہن بھائی ہیں۔ ان نے بابا آدم کو جنت سے نکالا، جل نے پاؤں میں بیڑی ڈالی
آدہی رات سے دریا میں کہڑا ہوں۔ اور پانی کا قیدی ہوں۔ جب جل نے جلایا۔ تو اس کی بہن
ان سے کیا محبت ہو،

چھیو رام، چھیو، چھیو، چھو اچھو، چھیو۔

ندی کنارے میں کہڑی پانی جہل مل ہوئے   میں میلی پیا اجلے میں کس طرح ملنا ہوئے

چھیو رام چھیو! چھیا۔ چھیا

کپڑے دہوئے ساری عمر دریا کنارے گذر گئی، مگر اپنا آپا میلا کا میلا رہا۔ صاف ستہرے
اور اجلے پیا کی نظروں میں میری کیا قدر ہوگی۔ اور اس تک کیونکر پہنچنا نصیب ہوگا

چھیو رام چھیو رام۔ چھو اچھو!

اچھی ری ذرا ایک بات اور سنتی جا۔ دیکھیو خدا آسمان کی کہڑکی میں سے جھانک کر مجہہ سے کچھہ
کہتا ہے۔ پورا تو سمجھہ میں نہیں آیا۔ سوائے اس کے کہ اس نے کہا

رام جھروکے بیٹھ کے سب کو مجرا لئے

جیسی جاکی چاکری ویسا واکو دے

تو جب اس کی دین چاکری پر ہے۔ تو لاؤ میں بہی اس دریا میں جہاز چلاؤں، دہوبی کیوں کہلاؤں
امیر البحر کیوں نہ بنوں۔ اس سنسار میں

گرن کی بھرن

ہے جو کرتا ہے. پاتا ہے. میں نے ساری عمر کپڑے دھوئے پیسے ٹکے پر نیت رکھی. اتنا ہی ملا.
خیال لگے بڑھاتا. رام زیادہ بھجواتا.

چھیو رام چھیا رام ہو اؤ. چھو

اری نتوا کی ماں تو تو خفا ہو گئی. کہاں چلی. لا میں روٹی کھالوں. تو جا مت. تیرا یہ خیال ہوگا.
میں تیرے خفا ہونے کی پرواہ نہیں کرونگا. اری مجھ کو تو اس کا بڑا دکھ ہوتا ہے. اور دل میں
بڑی جلن ہوتی ہے.

سائیں میں مت جانیو تو ہے چھوڑت موہے چین
گیلے بن کی لاکڑی سلگت ہوں دن رین

چھی ہو. چھی ہو. چھیا راما چھیا. چھو رام

اری کل رات کا خواب سن. میں نے دیکھا. ایک سندر عورت اپنے بالم کو مایوس پنے سے دیکھ
رہی ہے. مگر منہ سے کچھ کہہ نہیں سکتی. اتنے میں اس کا پیتم پیارا کہیں چلا گیا. اور وہ ہاتھ ملنے لگی
کہ ہائے میں تو دو باتیں بھی نہ کرنے پائی تھی. کہ پیا بچھڑ گئے.

میں نے کہا. تو کون ہے. اور یہ مرد کون تھا. عورت بولی میں روح یعنی آتما ہوں
اور یہ مرد پریم شکتی (مظہر عشق) ہے. خواب دنیا ہے. اور عالم اسباب ہے. اس عورت کی بات
تو میری سمجھ میں آئی نہیں. ہاں اتنا ضرور ہوا. کہ اس نے جو دوہا پڑھا تھا. وہ یاد ہو گیا

سپنے میں موہے پی ملے کر نہ سکی کچھ بات
سوتی تھی روتی اٹھی. ملت رہی دو ہاتھ

راما چھیو اچھو اچھو. چھو.

ہاں! نتوا کے باپ یہ تو بتا. تو میرا پیا. میں تیری پیاری. تو میرا دھوبی. میں تیری دھوبن. پھر
یہ پپیہا. پی کہاں. پی کہاں. کیوں پکارتا ہے. اس کو پی پی کہنے کا کیا حق ہے.

تو کپڑے دہو چکے۔ تو کچہری جا مو۔ اور پیا پیاری کے نام کو انگریز بہادر سے لکھوا لائیو
اس کے بعد پپیہا پی کو پکارے گا۔ تو میں نالش کر دونگی۔

نہیں منوا کی ماں۔ یہ تیری غلطی ہے۔ پی کا پکارنا۔ پیا کا پیارا بننا۔ آسان نہیں ہے
دیکھہ بہو تر اکیسا کالا ہوتا ہے۔ مگر پی کی محبت میں اس کے منہ کی رنگت زرد ہوتی ہے۔ اری
اس پریم کی بڑی کٹھن ہٹیا ہے۔ پپیہا بھی جھوٹ موٹ پی کو پکارتا ہے۔ اور تو بھی خواہ مخواہ
اس میں جھگڑا کرتی ہے۔ جن کے من میں پی بستا ہے۔ ان کے منہ زرد پڑ جاتے ہیں

جا من میں پیا بسے تمہہ پیرا ہوئے
جالبجاری دہیں دہریا۔ پکا پکو کردیں دہریا۔

منوا کے باپو۔ یہ رات کو چکوا چکوی آپس میں کیا باتیں کرتے تھے۔ میں نے تو اتنا سنا
کہ چکوا جمنا کے اس پار اپنی چکوی کو پکارتا تھا۔ اور چکوی اس پار اپنے چکوے کو آواز دیتی
تھی۔ جب ان کے پر تھے۔ تو اڑ کر پاس کیوں نہیں جاتے تھے۔

دیوانی! پریم کی ہزاروں ریتیں ہیں۔ کہیں پروانہ چراغ پر آکر جل جاتا ہے۔ کہیں بلبل
پہول کو گلے سے لگاتا ہے۔ لوہے کو مقناطیس کی محبت دی گئی ہے۔ کہ دیکھتا ہے۔ تو بے
اختیار اس کیطرف دوڑتا ہے۔ تنکہ کہربا پر فریفتہ ہے۔ دیدار پاتا ہے۔ تو لپک کر سینہ
سے چمٹ جاتا ہے۔ مگر چکوے چکوی کی محبت یہی ہے۔ کہ وہ جدائی کی بہار دیکھیں۔ وہ آپس
میں مل نہیں سکتے۔ ساری عمر ترستے بیتی ہیں۔ اسی واسطے تو کہا ہے۔ کہ چکوا چکوی کو نہ ستاؤ۔ کہ
کہ وہ تو خود محبت کے ستائے ہوئے جدائی کے صدمے اٹھائے ہوئے ہیں۔

چھیو رام چھیو چھیو،

منوا کے باپو تو نے کل کہا تھا۔ یثرب نگر میں ہمارے چودہری سارے سنسار کے منوں
کو دہونے آگئے تھے۔ اس کا بھید مجھہ کو بتا۔ کہ یہ کیا بات تھی

ادہو۔ تو تو بڑی مور کہہ ہے۔ چل تجھے قوالی میں لے چلوں۔ وہاں یہ بھید آپ ہی میں

ابجائے گا۔ قوال گا رہے تھے۔

میری میلی گدڑیا دہو دے!!

دہوبی نے کہا یہ میلی گدڑیا ساری دنیا ہے۔ خود ہمارے وجود ہیں۔ اور ان کو گنا ہوں اور شک وشبہ کے دہبوں سے صاف کرنے کے لئے خدا نے یثرب نگر میں جو عرب میں ہے اور جس کو مدینہ بھی کہتے ہیں۔ ایک بڑے چودہری کو پیدا کیا جس نے سارے جہان کے دہبے دور کر دیئے اور یہ سب میلی گدڑیاں دہو کر رکھدیں۔ یہی تو وجہ ہے۔ کہ میں بے چارا غریب دہوبی کا غذی گہاٹ پر کپڑے دہوتے آیا ہوں۔

جادم کی درخواست

دلی میں مینہ نہیں برستا۔ ابر بھی نہیں آتا۔ لڑائی نے ملکوں کا جغرافیہ بدل دیا ہے تو کیا بادلوں کا جغرافیہ بھی کچھہ تبدیل ہو گیا۔ وہ دلی میں کیوں نہیں آتے۔

سنتے ہیں بارش سمندر کی بخارات سے ہوتی ہے۔ تو کیا سمندر سے دلی کے حصے کا بخار اُتر گیا۔ اس کو کس ڈاکٹر نے کونین کی گولی دی

خدا سمندر کے دل میں ہجر کی آگ بھڑکائے تا کہ اس کی آہوں کے بخارات آنسو بن کر ہم تک آئیں۔ اگر یہ غلط ہے۔ اور سمندر کا اس میں کچھہ دخل نہیں۔ تو ہم اہل سائنس سے درخواست کرتے ہیں۔ کہ وہ اہل دہلی کے واسطے بارش بذریعہ وی پی پارسل بھیجدیں۔ ہم سب لوگ چندہ کر کے یہ وی پی وصول کرلیں گے۔

اگر اہل سائنس کا اس میں کچھہ اختیار نہ ہو۔ تو ہمیں چار و ناچار خدا کے آگے جھکنا پڑیگا جو ذرا پوزیشن کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ مگر مجبوری انسان سے سب کچھہ کراتی ہے۔ خشک سالی سے ناک میں دم آگیا ہے۔ اس واسطے اپنی ناک کو خاک میں رگڑیں گے۔ تا کہ دم خاک میں چلا جائے اور ہمارا نام آدم کے بدلے جادم مشہور ہوجائے

فرامِ بکری

منکہ یک گوسفند غریب ولد گوسفند حقیر ساکن قتلگاہ دنیا۔ پیشہ بے کسی و بیچارگی دعوے کرتی ہوں عدالت انصاف خدا پرستی میں بموجب اس دفعہ کے جس کا انگریزی اسم لائیبل اور ویسی اسم ازالہ حیثیت عرفی ہے۔ اور قانون الحقایق و دقایق رمز شناس۔ حیات و ممات یعنی ڈاکٹر شیخ محمد اقبال المخاطب بہ سر الوصال سندیافتہ بیرسٹری و ڈگری یافتہ پی۔ ایچ ڈی۔ ساکن محلہ منقول۔ انارکلی کے۔

دعوے یہ ہے۔ کہ مدعا علیہ ذی شان نے۔ حکیم افلاطون و لسان الغیب حضرت حافظ شیرازی کو گوسفند سے تشبیہہ دے کر خلقت کو ان سے حذر و احتیاط کی تاکید کی ہے۔ اور معناً مجھ مدعیہ کی تحقیر و تذلیل بر سر عام شایع کیا ہے۔ اور میری ہزاروں برس کی مذہبی وقعت کو نوک قلم سے ٹھکرایا ہے۔

مجھے اس سے بحث نہیں کہ حضرت حافظ اور افلاطون کی نسبت جو رکیک خیالات ظاہر کئے گئے ہیں۔ وہ حق ہیں یا ناحق۔ جا ہیں یا بے جا۔ کیونکہ یہ باتیں اسوقت میں چھاپی گئی ہیں۔ جب کہ ان بزرگوں اور ان سے بڑے بڑے درجے والے پیشواؤں کی علانیہ بے حرمتی کی جاتی ہے۔ ان کے ٹھٹھے اڑائے جاتے ہیں۔ اُن کے مقلدین پر نفرت و ملامت کے آوازے پڑتے ہیں۔ اور ان کے حامیوں کو دین و ملت کا دشمن بیان کر کے نئی نسلوں کو ان سے بیزار کیا جاتا ہے۔

مجھے یاد ہے۔ کہ علامہ شبلی نعمانی نے کھلم کھلا حضرت حافظ کو شراب خوار لکھا ہے۔ میں بے خبر نہیں ہوں۔ کہ علامہ مرحوم کے شاگرد ابو الکلام صاحب نے اجمیر شریف کے متعلق اور عام صوفیائے کرام کے بارے میں مغلظات دشنام نویسی کی ہے۔ میں اس سے بھی خبردار ہوں کہ زمیندار کے موجودہ ایڈیٹر صاحب نے حضرت حافظ کو رقاص تہر کنے والا خطاب دیا ہے

پس جب وقت کے اتنے بڑے بڑے لوگ ایک طرف ہوں - اور دستار حافظ سر بازار اچھالیں - تو کس کی مجال ہے - جو سامنے آئے - قوم ان کے ہاتھ میں - قوم کی آواز ان کے ساتھ میں - جو چاہیں دلوں میں اور دماغوں میں اتار دیں جسطرف ان کے قلم کو جنبش ہوگی - ساری خلقت اسطرف ہو جائے گی - پھر میں غریب بکری اگر حضرت حافظ اور حکیم افلاطون کی حمایت میں کچھ بولوں تو کیا حاصل - اسی لیے عرضی دعوے میں اپنے زخم خدا پرستی کی کچہری کو دکھانے چاہتی ہوں۔

اقبال نے کہا الحذر از گوسفنداں الحذر، اور زمیندار نے بھی اسکو طغرائے مضمون بنایا ہے - میں پوچھتی ہوں کہ اقبال و زمیندار کا حضرت موسیٰؑ پر ایمان ہے - یا نہیں جنکی ابتدا میری خدمت سے شروع ہوئی تھی - اور میری ہی خدمت کی بدولت خدا نے ان کو دنیا میں عروج اور عقبیٰ میں کمال عطا فرمایا تھا وہ بکریاں چرانے والے موسیٰ تھے - جنکی قوم نے فرعون کو پامال کیا - اور سینکڑوں برس بادشاہت کی - موسیٰ نے گوسفندوں سے حذر نہیں کیا اور مراد پائی - تم حذر کرو گے تو نامراد کیوں نہ ہو گے۔

موسےٰ پر ایمان نہیں لاتے، کٹے محمدی بنتے ہو - سند توریت سے تیوری چڑھاتے ہو تو میں اپنے زلفوں والے داتا محمدؐ کا وسیلہ لاتی ہوں - اُنہوں نے بھی گوسفند سے حذر نہیں کیا - بچپن میں بلکہ یوں کہو - کہ دنیا میں سب سے پہلا کام یہ کیا - کہ میری نسل کی پاسبانی کی - مجھ کو جنگل میں چرانے لے گئے میری خاطر بیابان کی دھوپ برداشت کی - میں ذلیل و حقیر ہوتی - مجھ میں کوئی ایسی خرابی ہوتی - کہ حذر و احتیاط کا حکم لگتا - تو سب سے پہلے وہ حکیموں کا حکیم فلاسفروں کا فلاسفر - مدبروں کا مدبر ادھر متوجہ ہوتا - اور الحذر از گوسفنداں فرماتا۔

جب اقبال و زمیندار، موسیٰؑ و محمدؐ پر ایمان کا دعوے کرتے ہیں - تو بتائیں کہ اُنہوں نے مجھے اس ذلت و حقارت سے کیوں یاد کیا - اور اس طرح عامیانہ توہین کیوں روا رکھی،

اگر ان کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تو میں عرضی دعوے اقتصادی و مادی زبان میں لکھو گی۔ کہ میں انسانی خصوصاً مسلمانی خوراک کا جزو اعظم ہوں۔ سے زمانے لاکھوں بچے انسان کی غذا پر قربان کرتی ہوں اور تم لوگ قربانی کرنے والوں سے عشق کا دم بھرتے ہو پھر بتاؤ۔ کہ میری برابر تم میں سے کون ایثار و قربانی کرتا ہے۔ سوائے اس کے۔ کہ الفاظی کے پل بنائے جاتے ہیں۔ اور انہی سے سوراج اور سیلف گورنمنٹ کے جلوس گزرتے ہیں۔

لہٰذا اقتصادی اور مادی اعتبار سے بھی میں حذر و حقارت کے لائق نہیں ہوں۔ میں خدا پرستی کی عدالت سے فریاد ہے۔ کہ میرے اس دعوے پر غور ہو۔ اور ملزموں سے باز پرس کی جائے۔

ضرورت ہے ایک پیر کی!

مرزا قدرت اللہ نے شادی کی نیا گھر تعمیر کیا۔ اس میں میز و کرسی سجائی۔ کمپونڈ میں چھوٹا سا باغیچہ بھی لگوایا۔ اس کے لئے مالی رکھا۔ میاں بیوی روزانہ کپڑے بدلتے ہیں۔ دھوبی کی نوکری بھی مستقل ہوئی۔ پانی کا خرچ زیادہ ہے۔ سقہ کو بھی کوٹھی کے احاطہ میں آباد کیا گیا۔ میرزا روزانہ ڈاڑھی منڈاتے ہیں۔ حجام کو روز روز کہاں بلایا جاتا۔ وہ بھی رات دن کا خانہ باش ہے۔ بیگم صاحبہ نارنگی کے چھلکے پر پاؤں رکھدیتی ہیں۔ تو چھینکیں آجاتی ہیں۔ کوئی دن بخار کھانسی دردسر سے خالی نہیں رہتا۔ ان کے واسطے حکیم اور خود مرزا صاحب کے لئے ڈاکٹر نوکر ہوا ہے۔ کیونکہ ایک کو یونانی علاج پسند ہے۔ اور دوسرے کو ولایتی۔

اب فکر صرف ایک پیر کا ہے۔ جو وقت بے وقت بیگم صاحبہ کو نظر بد کی حفاظت کے لئے دم کر جایا کرے۔ اور کوئی بچہ پیدا ہو۔ تو اس کے تعویذ گنڈے کی خبر رکھے۔ پانیر میں اشتہار دیا گیا ہے۔ چونکہ اس کی اشاعت خطیب سے زیادہ ہے۔ لہٰذا اطلاع دی جاتی ہے۔ کہ پانیر کے ذریعہ کی درخواست پر پہلے غور کیا جائے گا۔ اور برسات کے بعد کوئی عرضی قبول نہ ہوگی۔ کیونکہ غالباً ساون تک بیگم

صاحبہ کی رنجگی ہو جائے گی۔ اور پیر کی خدمت اسی موقعہ کے واسطے زیادہ درکار ہے۔

میلے کچیلے پیر درخواست نہ بھیجیں، نہ وہ پیر جن میں حسب ذیل عیب ہوں۔ ڈاڑھی بہت لمبی اور گنجان نہ ہو۔ پان سے نفرت نہ ہو۔ حقہ کے دشمن نہ ہوں۔ کسی کو شراب پیتے دیکھ کر اعتراض نہ کریں۔ نماز کے نہ خود عادی ہوں۔ نہ دوسروں کو مجبور کریں۔ روزہ کی لت بھی نہ ہو۔ ہر وقت تسبیح ہاتھ میں نہ رکھتے ہوں۔

تنخواہ سالانہ ۲۵ روپے۔ عید بقرعید پر انعام اندر بھی دیجائے گی۔ بیگم صاحبہ انکی مرید بھی ہو جائیں گی۔ شادی کے موقعہ پر گھر کے کمینوں اور نوکروں سے زیادہ ان کا خیال کیا جائے گا۔ اور پہلے ان کی نذر نیاز ادا ہوگی

خدانخواستہ گھر میں کوئی موتی ہوگئی۔ تو میت کے سب کپڑے اور چالیس دن کا کھانا ان ہی کو ملے گا۔

غرض اس گھر میں ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی امیدوار درخواست میں جلدی کا خیال رکھیں بی۔ اے پاس پیر کو ترجیح دی جائے گی۔

(۲)

ضرورت ہے اس پیر کی جس کے ابا جان۔ اماجان۔ آپا۔ خالہ۔ ماموں۔ چچا مرید تھے۔ جو ہمارے ہاں سال کے سال آتے تھے۔ چارپائی پر سرہانے کے رخ بیٹھتے تھے گھڑی گھڑی ان کے لیے حقہ بھرا جاتا تھا۔ ایک مرغ روز ذبح ہوتا تھا۔ جس کو صرف وہی پیر صاحب کھاتے تھے۔

میں بچپن میں پردیس چلا گیا۔ گھر والے سب مر گئے۔ کس سے پوچھوں۔ کہ وہ پیر کون تھے کہاں کے تھے۔ مجھ کو بھی انکا مرید ہونا ہے۔ کیونکہ اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ بے پیر اشیطان کا مرید ہو کر مرتا ہے۔ اتنا یاد ہے۔ انکی ڈاڑھی خشخاشی تھی۔ مونچھیں بڑی تھیں۔ صبح اور تیسرے پہر بھنگ کا پیالہ پیتے تھے۔ مرید کرتے وقت چیلہ کو بھی بھنگ پلاتے تھے۔ قوم کے اصل نسل سید

تھے۔ بڑی بڑی کرامتیں ان میں تھیں۔ ایک دفعہ انھوں نے صاف کہدیا تھا۔ کہ اب کے بھینس کٹرا دے گی۔ اور وہی ہوا۔

خبر نہیں وہ زندہ ہیں۔ یا مر گئے۔ کسی اخبار پڑھنے والے کو معلوم ہو۔ تو للہ خبر دینا۔ مجھے مرید ہونے کی از حد ضرورت ہے۔ اور مرید ہوئے بغیر سخت ہرج ہو رہا ہے۔ واجب جانکر عرض کیا۔

(۳)

اب ضرورت ہے ۔ ایک پیر کی بیرسٹر صاحب نے تو جواب دیدیا کہتے ہیں۔ مقدمہ میں کچھ جان باقی نہیں۔

حکیم صاحب فرماتے ہیں۔ مریضہ کوئی دم کی مہمان ہے۔ دوا بے کار ہے۔ علاج کا وقت نکل چکا۔ تو اب ایک پیر کی ضرورت ہے۔ شاید وہی اپنی کرامات سے ٹوٹی کی بوٹی پیدا کر دے

سررشتہ دار صاحب کی خوشامد کرلی۔ رشوت بھی دیدی۔ آس پاس کے سب مصاحبوں کی بھی مٹھیاں گرم کرچکا۔ مگر ڈپٹی صاحب تو ایسے ناراض ہیں۔ کہ کسی صورت منتے نہیں معلوم ہوتے لاؤ کسی پیر کو تلاش کریں۔ وہاں سے کوئی تسخیر کا نقش ہاتھ لگ جائے گا۔

اے حسینہ کیونکر ہو گا تجھ بن جینا۔ اخبار میں اشتہار دیتا ہوں۔ ایک پیر کو دریافت کرتا ہوں۔ جو جلتا ہوا حب کا تعویذ دیدے۔ اور۔ آہ اے یاد کرنے والی میں تجھ کو اس کی طاقت سے پاؤں۔

لالہ صاحب نے تو دق کر دیا۔ روز روز کے تقاضے ہیں۔ نالش کی دھمکیاں دیتے ہیں مکان قرق کرانے کی فکر میں ہیں۔ ایک ایسے پیر کی ضرورت ہے۔ جو دست غیب جانتا ہو یا گھوڑ دوڑ کا نمبر اور سٹہ بتاتا ہو۔ میں قرض کے سبب ایک پیر کا سخت ضرورت مند ہوں۔

اب کے کرکٹ فٹ بال کے میچ زیادہ ہوئے۔ امتحان قریب تھا۔ کہ شہر میں تھیٹر آگیا جی نہ مانا۔ بہت سی راتیں اس میں غارت ہو گئیں۔ دیکھئے۔ پاس ہوتا ہوں۔ یا فیل۔ بظاہر تو

پاس ہونے کی اُمید نہیں ہے۔ لہذا دریافت کرتا ہوں۔ کہ کسی کامل پیر کا پتہ بتایا جائے۔ مجھے دعا کرانے کے لیئے ایک پیر کی ضرورت ہے۔

ہائے نوکری تو کہاں ملتی ہے۔ خدا مل جائے۔ حضور نظام کی ملاقات میسر آجائے۔ مگر نوکری نصیب نہیں ہوتی۔ سنتا ہوں پیروں کی دعا میں بڑا اثر ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے۔ کہ پیروں کی بڑی بڑی جگہ رسائی ہوتی ہے۔ بس ایک پیر درکار ہے۔ جو دعا یا سفارش سے نوکری دلوا دے۔

(۴)

خدا نے علم دیا۔ اولاد دی۔ روپیہ دیا۔ پیسہ دیا۔ عزت آبرو دی۔ خطاب یافتہ ہوں بچوں کی شادیوں میں خوب نام حاصل کر چکا ہوں۔ اب ایک ارمان باقی ہے۔ کہ کسی اچھے پیر کا مرید بھی ہو جاؤں۔ اسی لیئے یہ اشتہار شایع کراتا ہوں۔ کہ "ضرورت ہے ایک پیر کی

پیر بہت نامور ہو۔ بڑے بڑے جج وکیل۔ انگریزی پڑھے لکھے۔ اس کے مرید ہوں۔ کیونکہ میں خدا کے فضل سے گھٹیا آدمی نہیں ہوں۔ جو ایسے گھٹیا پیر کا مرید ہوں۔ جو دھنے جلاہوں کو مرید کرتا ہو۔

مجھے معلوم ہوا ہے۔ کہ مرید ہونا بھی ہماری سوسائٹی کا ایک فیشن ہے۔ اور مجھ جیسا فیشن ایبل آدمی فیشن کو کبھی ترک نہ کرے گا۔

(۵)

یہ پیر خبر نہیں عام خلقت پر اتنا اثر کیوں رکھتے ہیں۔ سنا ہے۔ ان کو لاکھوں روپے نذر نیاز ملتی ہے۔ اور بغیر کوشش کے ملتی ہے۔ خدا کی شان ہے۔ ہماری کانفرنس ہماری انجمن ہمارے کالج۔ ہمارے سکول۔ ہمارے ندوہ کو ہزاروں جتن کرنے پر لوگ چندہ نہیں دیتے، اور ان پیروں کو گھر بیٹھے چھنا چھن منی آرڈر بھیجتے ہیں۔ سنا نہیں جب جلسہ میں کوئی پیر چلا گیا اس کو بے شمار چندہ مل جاتا ہے۔

چونکہ کمترین نے بھی ایک اسکول بچوں کی تعلیم اور اپنی ضروریات خانگی کے لیئے کھولا ہے۔ اور

اس کے واسطے چندہ جمع کرنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا ایک با اثر پیر کی سخت ضرورت ہے کوئی صاحب بتائیں۔ کہ مذکورہ مقصد کے قابل پیر کہاں دستیاب ہونگے۔

اے حسن نظامی تونے پیروں فقیروں کی خرابیاں تو ہزاروں گنوائیں۔ مرید ونکی حالت بھی تو لکھ۔ کہ وہ کن اغراض سے پیروں کے پاس جاتے ہیں۔ اور انکی مریدی کیا شان رکھتی ہے۔ اس واسطے تونے یہ مضمون لکھا۔ اور مریدوں کی تصویر کھینچکر دکھائی جس زمانہ میں مرید اس قماش کے رہ گئے ہوں۔ اس وقت کے پیروں پر اعتراض فضول ہے۔ بازار میں وہی جنس بکنے آتی ہے۔ جس کی مانگ اور ضرورت ہو۔ پس چونکہ طالب آج کل ایسے ہیں۔ جنکا ذکر اوپر کیا گیا۔ تو مطلوب بھی ویسے ہی ہو گئے ہیں۔

اے مضمون نگار فقرا اور شیخ پر طعن کرنے سے پہلے توان جھوٹے۔ نمائشی بندگان اغراض مریدوں کو ٹھوکریں مار اور انکی عقیدت کے اجزا کو الگ الگ کرکے دکھا۔ اور کہہ "اچھے پیر جب ملیں گے۔ کہ طلب اچھی ہوگی خدا والوں کو کیوں ڈھونڈا جاتا ہے۔ کیا متلاشی بھی خدا کے طلبگار ہیں۔ اصحاب ذوق حقانیت کی جستجو کس واسطے ہے۔ کیا جستجو کرنے والے مقصود بھی حقانی رکھتے ہیں"

نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ تو پیر ویسا کہاں بمثل مشہور ہے :۔

"جیسی روح ویسے فرشتے"

خدا پرستی کا نسخہ

ڈاکٹروں نے ایجاد کیا۔ گرمی گرمی کو مارتی ہے۔ زہر کو زہر اتارتا ہے۔ سنا نہیں چیچک و طاعون کے ٹیکے انہی بیماریوں کے زہر سے بنائے جاتے ہیں۔ پھر یہ خدا پرست لوگ نیا علاج کیوں نہیں کرتے۔ میں عیسائیوں آریوں اور مسلمانوں کو اپنی ایجاد جدید سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ وہ لوگوں کو خدا پرستی کی تندرستی اور روح کی درستی عطا کریں۔ اور خدا کی بھول سے بندوں کو بچائیں

جو عاقبت شکن مرض ہے۔

قرآن میں خدا نے فرمایا ہے۔ جب بندہ پر مصیبت آتی ہے۔ یا وہ بیمار ہوتا ہے۔ تو خلوص قلب سے خدا کو یاد کرتا ہے۔ اور جب تندرست ہوتا ہے۔ تو ایسا بے خبر ہو جاتا ہے۔ گویا کہ خدا سے کام ہی نہ پڑا تھا۔

انجیل و تورات میں بھی انسان کی اس فطری خصلت کا ذکر آیا ہے۔ پس منطقیانہ نتیجہ یہ نکلا۔ کہ آدمی کو بیمار ڈالنا اور مصیبت میں مبتلا کرنا چاہیے۔ تاکہ وہ خدا پرستی کرے اور خدا سے غافل نہ ہو۔

اس حالت میں پادری صاحبان کو لازم ہے۔ کہ شفا خانے بند کر دیں۔ اور ایسی دوائیں تقسیم کریں جن سے انسان بیمار زیادہ ہوں۔ بیماریاں بڑھیں گی۔ تو خدا پرستی بھی ترقی کرے گی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھی لازم ہے۔ کہ وہ کونسلوں میں تجویز پیش کریں۔ اور شہروں قصبوں سے سرکاری اسپتال اٹھوا دیں۔ کیونکہ ان عام دوا خانوں نے ہم کو از حد تندرست کر دیا ہے۔ اور اس تندرستی سے ہماری ایمان درستی میں فرق آ رہا ہے۔

فطرت بدلتی رہتی ہے۔ تو ہم کو بھی بدلتا رہنا چاہیے۔ کیا ضرورت ہے۔ کہ ہم وعظ کہہ کر اپنا دماغ خراب کریں۔ اور کتابیں ہدایت و خدا پرستی کے لیے تصنیف کر کے اپنا روپیہ کھوئیں۔ بہت آسان علاج ہے۔ نہایت مزیدار نسخہ ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے جس میں غور و خوض کی ضرورت ہی نہیں مگر میں۔ کہ اس نسخہ کا موجد ہوں از راہ حفظ ما تقدم عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ مجھ پر اس نسخہ کا تجربہ نہ کیا جائے۔ میں پریشانی و بیماری میں خدا کو اتنا یاد نہیں کرتا جتنا تندرستی میں جھک جھک کر اس کی عبادت بجا لاتا ہوں۔ اور کہتا ہوں۔

اے مولیٰ اس بھول کے عالم گیر زمانہ میں میری یاد قبول کر میں تجھ کو کیونکر بھولوں کہ تیرے احسان اور تیری نعمتیں مجھ کو سر سے لے کر پاؤں تک دبائے ڈالتی ہیں۔ اور تو مجھ کو اس وقت یاد آتا ہے۔ کہ زندگی کے مزے میں گرگراہٹ ہونے لگتی ہے۔ ہر گھڑی خیال یہی کہتا ہے۔ کہ

ی کے تماشے ہیچ ہیں۔ جو کچھ ہے۔ زندہ خدا کی دید و شنید میں ہے۔

چونکہ میں اس کلیہ سے مستثنیٰ ہوں۔ لہٰذا مجھ کو بیمار ڈالنے کی کوشش نہ کیجائے۔

ب جان کر عرض کیا۔

رشتہ یا خدا

جس کو دیکھا نہیں۔ جو نہ خود سامنے آئے نہ دوسرے کو آگے بلائے۔ اس سے محبت کیونکر
اس کے ساتھ مروت کیونکر برتی جائے۔ اس کا لحاظ کون کرے۔

رشتہ داری بڑی چیز ہے۔ وقت پڑتا ہے۔ تو اپنے رشتہ ہی کے لوگ کام آتے ہیں
سینہ کی جگہ خون بہاتے ہیں

رشتہ داری کے مقابلہ میں خدا کی رورعایت بہت مشکل کام ہے۔ زندگی دنیا میں ہے
خدا آخرت میں۔ رشتہ داری زندگی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس واسطے جس کو زندہ رہنا
ہو زندگی کو پر لطف رکھنا چاہتا ہو۔ اس کا کام تو یہی ہوگا۔ کہ رشتہ کو خدا پر مقدم رکھے جب
ے گا۔ زندگی ختم ہوجائے گی۔ اس وقت خدا سے تعلق کر لیا جائے گا۔ جیتے جی تو رشتہ کو
یں چھوڑا جاتا۔ اور ایک نامحسوس ان دیکھی چیز کی خاطر رشتہ کو توڑنا دشوار ہے۔

مگر دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں جنہوں نے خدا کو رشتہ پر فوقیت دی۔ رشتہ سے
ٹے خدا سے جڑے۔ خبر نہیں خدا نے ان لوگوں پر کیا جادو کر دیا تھا۔ کہ اس چمکتی دمکتی دنیا
ان کو سوائے خدا کے کچھ بھاتا ہی نہ تھا۔

مکہ میں ایک خدا کا پرستار

ے عرب کے ملک میں ایک شہر مکہ ہے۔ وہاں کوئی صاحب رہتے تھے۔ ان کو خدا نے اپنی
ت میں اسیر کر لیا معلوم نہیں۔ انہوں نے خدا میں ایسی کیا بات دیکھی تھی۔ کہ انکو سوائے خدا
بھی سے غرض ہی نہ تھی۔ اٹھتے خدا بیٹھتے خدا۔ سوتے خدا۔ جاگتے خدا۔ سب جانتے ہیں محبت

رنگ لائے بغیر نہیں رہتی۔ خدا کی چاہت خالی کیسے رہتی۔ گھر والوں اور کنبہ رشتہ کے لوگوں کو

یہ بات گوارا نہ ہوئی۔ اور انہوں نے خدا کے اس شیدائی کو اپنے شہر میں نہ رہنے دیا۔

کچھ اور لوگ بھی انکی دیکھا دیکھی خدا کی محبت کا دم بھرنے لگے تھے۔ یہ مکہ چھوڑ کر بیابان

عشق میں نکلے تو اکیلے نہ رہے۔ بہت سے لوگوں نے ساتھ دیا۔

ان حضرت نے مکہ چھوڑا۔ جو ان کا پیارا وطن تھا جس میں عمر کے چالیس سال بسر کئے

تھے۔ گھر چھوڑا۔ جہاں چچا بیٹی۔ داماد اور کنبہ کے سینکڑوں آدمی تھے اور مدینہ نامی ایک

قصبہ میں آن بسے۔

رشتوں کی ڈوری تلوار سے توڑی

اس ترک وطن پر بس نہ کی۔ بدر کے میدان میں اپنے رشتہ داروں سے تلوار چلانے کھڑے

ہوگئے۔ صرف اتنی سی بات پر کہ وہ خدا کی محبت سے منع کرتے تھے۔ اور موجود وحاضر بتوں کے

مقابلہ میں، غیر موجود وغائب خدا کی چاہت سے روکتے تھے۔

یہ صاحب نہ مانے ایک بڑی جمعیت کا جو ہتھیاروں اور سازوسامان سے آراستہ

تھی اپنے مٹھی بھر ساتھیوں سے مقابلہ کیا۔

یا تو اتفاقی بات یا واقعی خدا ہی نے کچھ کرشمہ دکھلایا۔ کہ یہ صاحب جیت گئے اور مکہ

والے بچارے چن چن کر تلواروں سے کٹ کر گر پڑے۔ اور جو بچے وہ رسیوں میں بندھ کر

مدینہ لائے گئے جہاں یہ حضرت رہتے تھے۔

ذرا خیال کرنا تلوار سے اتنے رشتہ داروں کے سر کاٹ کر بھی ان کو رشتہ کا خیال

نہ آیا، اپنے سگے چچا عباسؓ اور حقیقی داماد ابوالعاص۔ اور خبر نہیں کتنے رشتہ داروں کو

قیدی بنا دیکھا، اور پرواہ نہ کی

ہائے خدا نے ان صاحب کو اپنے عزیزوں سے کیسا توڑا یا تھا۔ کہ رات کو اپنے چچا عباسؓ

کی آہیں سنتے تھے۔ کیونکہ ان کے ہاتھ میں رسی بہت چبھ رہی تھی۔ مگر رہائی کا حکم نہ دیتے تھے

کہتے ہیں۔ دل پر تو ان کے بھی اتنا اثر تھا۔ کہ چچا کی تکلیف کے سبب رات بھر نہ سوئے۔ مگر خدا کا
دشمن خیال کر کے رشتہ کی پرواہ نہ کی اور چچا و داماد جیسے قیدیوں سے ذرا بھی رعایت نہ فرمائی
صبح ہوئی قیدی سامنے لائے گئے تجویز ہوئی۔ کہ سب کے سر کاٹ دیئے جائیں اس وقت
ان کو ترس آیا۔ ایک طرف رشتہ داری انسانی ہمدردی کا خیال تھا۔ دوسری طرف یہ کہ میرے معشوق
خدا کے دشمن ہیں ان کا مار ڈالنا ہی اچھا۔

آخر سب عاشقان خدا سے رائے لی۔ اور فیصلہ اسپر ٹھہرا۔ کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے

بیٹی کی ہیکل

اُف کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ خدا نے ایک باپ کو اولاد سے بھی بے پروا کر دیا تھا۔ اپنی الفت کی کچھ
ایسی بُرکی ڈالی تھی۔ کہ خدا کے نام کے سامنے کسی کا خیال ہی نہ آتا تھا۔

قیدی رہا ہونے لگے، تو ان حضرت کے داماد ابو العاص کا فدیہ سامنے آیا۔ جو خود ان
ہی صاحب کی بیٹی زینب نے مکہ سے اپنے شوہر کو چھڑانے کے لیے باپ کے پاس بھیجی تھی
یہ وہ ہیکل تھی جس کو خود ان ہی حضرت نے بیٹی کو جہیز میں دیا تھا۔ ہیکل سامنے آئی۔ تو ان کو
وہ زمانہ یاد آگیا۔ جب اپنی آنکھوں کی تارا لاڈلی بیٹی کو بیاہا تھا۔ اور یہ ہیکل جہیز میں دی تھی
آخر بشر تھے رشتہ کی محبت نے ذرا سا اثر کیا بے اختیار آنکھوں میں آنسو بھر گئے
دیکھا سامنے داماد رسی سے بندھا کھڑا ہے۔ اور غریب و مفلس بیٹی نے اپنے خاوند کی رہائی کے لئے
میری دی ہوئی ہیکل بھیجی ہے۔ اس بیکس کے پاس سوائے ہیکل کے کچھ نہ ہوگا یہ اس کا پیارا زیور ہی
جس سے اس کو بہت محبت ہوگی، ۔ مگر شوہر کی خاطر اس نے کلیجہ کو مسوس کر یہ گلے کا ہار
اتار کر بھیج دیا۔ بیٹی نے خیال تو کیا ہوگا۔ کہ ایسی بھی کیا بات ہے کہ داماد کو بغیر فدیہ کے باوا
جان رہائی نہ دیں گے مگر سمجھی ہوگی۔ کہ وہ تو خدا کی محبت میں رشتہ کی پروا بھی نہیں کرتے ہیکل
بھیجے بغیر چارہ نہیں۔

مسلمانوں سے خطاب

لوگو! ایک تو یہ صاحب ہیں۔ جنہوں نے خدا کو رشتہ پر اس سختی سے مقدم رکھا۔ اور خدا کے معاملہ میں کسی عزیز قریب کنبہ دار کی پرواہ نہ کی۔ اور ایک وہ لوگ ہیں۔ جو دعوے تو کرتے ہیں۔ کہ ہم اپنی مدینہ والے عاشق خدا کے پیرو ہیں۔ لیکن جب امتحان کا وقت آتا ہے۔ تو خدا کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اور رشتہ کنبہ کی پاس داری کرتے ہیں۔

میں تو جانوں آج کل کے لوگ ٹھیک ہیں۔ اور انہوں نے دنیا کی قدر جانی ہے۔ رہیں دنیا میں محبت کریں خدا سے۔ یہ کونسی دانشمندی کی بات ہے۔ خدا مرنے کے بعد ہے زندگی میں اس سے کیا سروکار۔ مر جائیں گے اس وقت خدا کی بات کو سب کام پر مقدم رکھا کریں گے۔ اب تو جیتے ہیں اپنے رشتہ داروں میں۔ دو گھڑی ہنس بول کر وقت گذار لینے دو۔ کیوں تم زندگانی کو بیمزہ کراتے ہو۔ کہ صاحب سب کو چھوڑ دو۔ اور خدا کو چاہو۔

میں نے ڈر کے مارے ان مکہ مدینہ والے حضرتؐ کا نام نہیں لکھا۔ کیونکہ ان کے نام میں یہ تاثیر ہے۔ کہ جو شخص ایک دفعہ سن لے خدا کا عاشق ہو جاتا ہے۔ رشتہ کنبہ اور دنیا کی باتوں کو چھوڑ خدا خدا جپنے لگتا ہے۔ میں اگر وہ نام لکھہ دیتا۔ تو اس مضمون کے پڑھنے والے ہی کہنے لگتے۔ قربان اس عاشق مزاج کے دل حق پرست کے جس نے اصل پیدا کرنے والے کو پیارا بنایا۔ اور سارے اغیار کو ورق خیال سے مٹا دیا۔ خدا ہی اس قابل ہے۔ کہ اس سے محبت کی جائے۔ جو کھانے کو روٹی پینے کو پانی۔ سانس کو ہوا۔ سونے کو زمین۔ دیکھنے کو آنکھہ سننے کو کان۔ بولنے کو زبان دے آدمی اسی کو نہ چاہے۔ تو بڑا ہی احمق ہے۔ گو وہ نظر نہیں آتا۔ مگر ہے تو وہی ہر گناہ کا داتا۔

اسی لیئے میں نے گول مول ذکر کیا کھول کر نام نہ لیا۔ کیونکہ مجھہ کو دنیا میں رہنا ہے۔ اور جس کو دنیا کی زیست درکار ہو۔ اس کو کنبہ رشتہ سے دل لگانا چاہیئے۔ کہ دنیا کا مزا ان ہی لوگوں سے ہے۔

میں تو یہ چاہتا ہوں۔ کہ آدمی اپنی خودی سے محبت کرے۔ خدا کا نام ہی منے خودی ہے تو جہان ہے۔ زمین ہے آسمان ہے۔ خود نہیں تو کچھ نہیں۔ دم کے ہیں سب دمدمے جب دم نہیں تو کچھ نہیں۔" دم ہے۔ تو ہم ہیں۔ ہم ہیں تو خودی ہے۔ خودی ہے۔ تو رشتہ دار جان کے ساتھ کہ خودی اور باہمی رشتوں کے جڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔

خدا ہوا۔ تو خودی کہاں۔ خودی نہیں۔ تو دنیا کی حکومت ہاتھ کٹے گی۔ نہ عزت نہ حرمت نہ عیش نہ آرام۔ نہ رشتہ داریاں۔ اور نہ گھرداریاں۔

اے خدا اپنی محبت میں ہر آدمی کو گرفتار نہ کیا کر۔ تو اس آخرت کے وعدے کر کے جہاں ہمیشہ رہنا ہے۔ کیوں دنیاوی مزوں کو کرکرا کرتا ہے۔ اور کیوں ایک ایسی لمبی زندگانی کی امید دلاتا ہے جس کا کبھی خاتمہ ہی نہ ہوگا۔ انسانوں کے دل اس غیر فانی حالت سے اکتا نہ جائیں گے اب تو رشتہ جوڑنے دے۔ دنیا کی برادری بننے کی اجازت مرحمت کر۔ تیری محبت بہت ہو چکی کب تک بھولے بھالے آدمیوں سے کھیلے گا۔ خدا خدا خدا۔ بس تم کچھ نہیں۔

مسلمان جب پاگل ہوتا ہے

تو اس کی بڑ کیا ہوتی ہے۔ کم سے کم ہندوستان کے پاگل خانوں میں اس کا تجربہ کرنا چاہیے۔ میں نے مختلف صوبوں اور شہروں کے پاگل خانے محض اسی عرفان کی خاطر دیکھے۔ اور نتیجہ یہ نکالا۔ کہ مسلمان جب پاگل ہوتا ہے۔ تو اس کو امام مہدی یا بادشاہ وقت ہونے کا وہم ہوتا ہے۔ ہر وقت اس کی زبان سے یہ بڑ نکلتی رہتی ہے۔ کہ میں ملک کا بادشاہ یا موعودہ مہدی ہوں۔

مسلمان کی فطرت میں حکومت اور سرداری خمیر کی گئی ہے۔ قرآن نے جس دن اس سے کہا" وانتم الاعلون" تم سردار ہو، تم بلند مرتبہ ہو۔ تم اونچے ہو۔ اسی دن سے مسلمانوں کی خصلت میں سرداری شامل ہو گئی۔ اب وہ پاگل بھی ہوتا ہے۔ تو بادشاہی کا خیال ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔

مسلمانوں کا معشوق بھی جنگی ہے۔ انکی شاعری کے معشوق کو دیکھئے۔ ہتیاروں کا پتلا نظر آئے گا۔ اس سے بھی اس قوم کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہتے ہیں۔ تیر نظر۔ کمان ابرو۔ تیغ نگاہ

آج کل الہ آباد میں اسی قسم کے ایک پاگل کا ظہور ہوا ہے۔ اُنہوں نے خطوط چھپوائے ہیں۔ جنپر انکی تصویر ہے۔ آج ایک خط ہمارے ہاں درگاہ میں بھی آیا تھا۔ لکھا ہے یہ تصویر تعویذ ہے۔ جو اپنے پاس رکھیگا۔ دین دنیا کی مرادیں پائے گا۔ یہ تو بکار خویش ہشیار جنوں ہے۔ اس کے بعد تصویر کے اُس پاس جو فقرے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت مسلمانوں کے عام مرض میں مبتلا ہیں۔ ایک طرف لکھا ہے۔ شاہ ولایت۔ ایک جانب تحریر ہے۔ قطب وقت۔ ایک رخ درج ہے ابوالوقت ایک سمت میں ہے امام مہدی۔

بچوں کی خصلت دیکھا کرتے تھے۔ کہ بنیہ کا بچہ دکان کا کھیل کھیلتا ہے۔ پیرزادہ کا بچہ کھیل میں پیر گدڑ کا عرس کرتا ہے۔ جولاہے کا بچہ تانا بانا۔ اور حجام کا بچہ جھوٹ موٹ کا استرا لیے پھرتا ہے۔ اب بڑوں کے کیرکٹر آزمائے جاتے ہیں۔ دنیا کی ہر قوم ایک عجوبہ ہے۔ قدرت کی نیرنگی کا۔ اور مسلمان ان سب میں عجیب تر ہیں۔ ان میں ہر مہدی ہاتھ لگ سکتا ہے۔ اور ہر قسم کی مہدویت کامیاب ہوسکتی ہے۔ خواہ کیسی ہی بے جوڑ ہو۔

حدیثوں میں بنی فاطمہ کے مہدی موعود کا وعدہ آیا ہے۔ ہندوستان میں ان چنگیزیوں کی نسل نے مہدی موعود کا دعوے کیا جو بغداد میں لاکھوں سادات بنی ہاشم کو تہ تیغ کر چکے ہیں مگر یہ ان میل دعوے بھی ناکام رہا۔

ڈاکٹری خواہ کتنی ہی ترقی کرے ناقص رہے گی جبتک وہ انسان کے دماغ کے قومی خصائل کی رو سے تحقیقات نہ کرے۔ اور نتائج نہ نکالے۔

دیکھئے الہ آباد کے مہدی صاحب جو ابوالوقت بھی ہیں۔ ان بچوں کیساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ جو ابن الوقت کہلاتے ہیں۔ رشتہ میں تو یہ لوگ ان کے پوتے ہوئے۔ مگر جس دادا کے پوتوں سے یہ ساری دنیا بھری ہوئی ہو۔ اس کی کامیابی میں تو کوئی شبہ نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا

آج کل سب کی سب ابن الوقت ہیں۔ اور اس کو قدرتاً اپنے دادا ابوالوقت کا ساتھ دینا ہوگا۔

عید کی چھینک

اپ چھیں۔ آپ چھیں، شکر الحمد للہ۔ یرحمک اللہ۔ یہدیک اللہ ویصلح بالک۔ اپ چھیں، آپ چھیں۔ اب کچھ نہیں۔ یہ تو زکام کی چھینک ہے۔ گھڑی گھڑی الحمد للہ نہیں کہوں گا جس کے جواب میں دوسرا یرحمک اللہ کہے اور مجھ کو دوبارہ یہدیک اللہ ویصلح بالک کہنا پڑے

کم بخت دیسی عطر میں یہ بڑی خرابی ہے۔ نزلہ پیدا کرتا ہے۔ عید کا دن ہے۔ غسل کیا۔ آدھے تانے آدھے باسی کپڑے بدلے۔ لکھنؤ کا عطر لگایا۔ اب عید گاہ جاتا ہوں۔ مگر چھینکیں آئے جاتی ہیں۔ اپ چھیں ایسی حالت میں نماز کیونکر پڑھوں۔ آپ چھ ...... افوہ چھینک رک گئی۔ ہنسی بھی آتی ہے۔ اور غصہ بھی۔ یہ کیا موقعہ نزلہ کا تھا۔

ناک پوچھنے کا رومال خریدنا پڑے گا۔ مگر یہ تو نئے لوگوں کی تقلید ہے۔ میں اپنے کرتے یا اچکن کے دامن سے پوچھ لونگا۔ کیا ضرورت ہے۔ کہ دو آنے رومال میں خرچ کر دوں کہتے ہیں۔ کہ چھینک خدا کی رحمت ہے۔ دماغ کا بخار اس سے اُتر جاتا ہے۔ جب ہی تو خدا مسلمان سے الحمد للہ کہلواتا ہے۔

کیسی مشکل ہے۔ روٹی کھاؤ۔ تو خدا کا شکر کرو۔ پانی پیو۔ تو خدا کا شکر کرو سوؤ جاگو پیدا ہو۔ مرو۔ بیمار ہو۔ تندرست ہو۔ ہر وقت خدا کا ٹیکس ضرور دو۔ حد ہے۔ کہ چھینک آئی۔ منہ کھلا۔ آنکھیں تھرتھرائیں۔ گلے کی کھال اوپر کو سمٹی۔ ناک کے نتھنے ذرا کھنچے اور سر نے ایک زور کا جھٹکا کھایا۔ کیسی مصیبت تھی کیسی بے اختیارانہ حرکت تھی۔ اس پر خدا کا شکر خدا کا ٹیکس موجود ہے۔

یہ عید کا دن ہے۔ میں بجا دیدوں گا۔ اور کچھ نہیں دیتا۔ خدا اپنے نزلے اور چھینکوں کو ضبط کرلے۔ مجھے ان کی پرواہ نہیں ہے۔ میرے بکھیڑوں میں ناک کا گیت تھا۔ اس چھینک کی

بچکولے سے سانس کے بہو پہنچانے میں یا ختم نہیں۔ کہاں گر پڑا۔ چھینک کا کیا گیا۔ میرا تو نقصان ہو گیا

خدا کرے۔ آج حاذق الملک بہادر کو بھی بہت سی چھینکیں آئیں۔ ناک سنکتے سنکتے ناک میں دم آجائے۔ کیونکہ مجھے تو یقین ہے۔ کہ پھر وہ چھینکوں اور نزلہ کا ایک نسخہ بنا دیں گے۔ اور آئندہ عید کے دن کسی کو چھینک نہ آیا کرے گی۔ آآ چھیں! آچھیں! ارے ہے نزلہ

روح کی فروخت

کہتے ہیں۔ یہ زمانہ مادی ہے۔ یہ روح اور روحانیات سے بے خبر ہے۔ مگر اس کا ثبوت مانگو تو نہیں دے سکتے۔ صرف اتنا کہتے ہیں۔ کہ آج کل ہر ترقی کی بنیاد مادیت پر ہے اور انتہائی نتیجہ مادیت کا نکلتا ہے۔

میں نے اس کی نسبت شیخ المادیین عارف منکرین ارواح مسٹر ڈارون سے پوچھا۔ تو انہوں نے اپنے مقام فلسفہ سے یہ جواب بھیجا!

میری عبادت گزار دنیا روح سے جتنی واقف ہے۔ تم ارواح پرست لوگ اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ میرے مومنین روح کی تجارت کرتے ہیں۔ خود اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں تم روح کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہو۔ ہندو ہو یا مسلمان اپنے بزرگوں کی ارواح کو کھانا کپڑا نقدی خیرات کے ذریعہ بھجواتا ہے۔ اگر تم نے روح سے تعلق رکھا۔ اور ارباب روحانیت کہلائے تو خود تمہاری ذات کو کیا فائدہ ہوا۔

اصلی روحانیت ہماری ہے۔ کہ روح کو گرفتار کر کے فروخت کر ڈالتے ہیں۔ اور اس کے داموں سے اپنی روح کو تروتازگی دیتے ہیں۔

غور کرو نئے زمانہ نے املتاس کی روح نکالی۔ اور یونانی حکیموں کے جلابی قدح اس کے سامنے مات ہو گئے۔ خوشبو کی روح نکالی۔ اور لکھنؤ و قنوج کی ارواح پرستوں سے

جو خوشبو کا جسم فروخت کرتے تھے۔ ہزاروں میں آگے بڑھ گیا۔ ان دو پر کیا حصر ہے۔ نئی روشنی نے تو ہر چیز کی روح بدنوں سے نکال کر بازار میں بیچنے کو بھیجدی ہے۔ پرانی روشنی بھی کہ ہر ستہ بدن میں جان ہے۔ تو کوئی مانے گا۔ کیونکہ اس کا دم بھی مدت ہوئی مشین کشش ارواح سے کھینچ کر نکال لیا گیا۔

حق یہ ہے۔ کہ اصل روحانی لوگ یہی نئے زمانہ والے ہیں جنکی روح تابعدار ہے۔ نہ کہ ہم جو کہ روح کے محکوم بنے ہوئے ہیں۔

قرآن میں خدا نے فرمایا ہے۔ اطاعت کرو۔ خدا اور رسول کی اور امر والوں کی۔ لوگ جھگڑتے ہیں۔ کہ امر والے سے مراد بادشاہ وقت ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے۔ کہ امر سے مراد روح ہے۔ کیونکہ قرآن ہی میں خدا نے فرمایا ہے۔ کہ روح امر ربی ہے۔ تو معلوم ہوا۔ کہ خدا نے اطاعت اولوالامر کے حکم میں اصحاب روحانیت کو مراد رکھا ہے۔ اور روحانیت نئے زمانے کے اوپر ثابت ہوگئی۔ پس نتیجہ نکلا۔ کہ ہم سب کو نئی روشنی کی اطاعت حکم خدا سے واجب ہے۔ اگر ہم بھی ارواح کی تجارت کرنے لگیں۔ تو روحانی بن جائیں۔

اخبار ہمدم کو چاہیئے۔ کہ کاغذ کی روح نکالنے پر غور کرے کاغذ مہنگا ہوگیا ہے۔ روح اس کی خوب بکے گی۔ اور ہمدم ان سٹاف روحانیوں کا پیشوا بن جائے گا۔ قدرتاً ہی اس کے نام میں دم یعنی روح موجود ہے۔ تھری چیرز فار مسٹر ڈارون۔

باب دوم

امور تمدن و معاشرت

لکھنؤ کی کیل

جرمن کی ہر کیل سے چھوٹی ہوتی ہے۔ مگر بڑی ہی کھوٹی ہوتی ہے۔ جرمنی کی کیل میں جہاز مخفی ہیں۔ لکھنؤ کی کیل خود پان میں پوشیدہ رہتی ہے۔ لکھنؤ میں رواج ہے۔ کہ تنبولاڑی پان کی گلوری میں لوہے کی کیل لگادیتے ہیں۔ جو اکثر انجان و اجنبی آدمیوں کے منہ کو زخمی کردیتی ہے۔ میں نے پان کے بیڑے سے پوچھا۔ تجھ میں اتنی شرارت کیوں ہے۔ اس نے کہا۔ اس لیئے کہ انسان ہر چیز کو دیکھ بھال کر کھائے۔ اور غفلت کی عادت کو چھوڑے۔ بے دیکھے کھائے گا۔ تو سزا پائے گا۔ یہ سنکر تجویز ہوئی۔ کہ آیندہ روٹی میں سوئیاں پکانی چاہئیں۔ تاکہ کھانے والے ہر نوالے کو غور و احتیاط سے کھائیں۔ اور اکل حلال تک رسائی پائیں۔

مقتول کا رقص

کل میدان جنگ میں ایک مقتول تڑپتا تھا۔ میں نے اس کے سر کو اپنے زانو پر رکھا۔ اور اس کے رقاص جسم کی بہار دیکھی۔ ملک الموت نے کہا۔ اس کو میری گود میں دو۔ میں نے کہا ٹھیرو! اس کی رقص کی تیر کرلوں۔ فرشتہ بگڑا۔ اور بولا۔ کوئی اپنی جان سے جاتا ہے۔ آپ کو اس میں مزا آتا ہے؟ میں نے کہا بھائی ہر قوم کا ایک رقص اور اس میں ایک لطف ہے۔ صوفی باطنی تلوار سے مجروح

ہو کر ناچتا ہے۔ اور زخمی ظاہری تیغ سے دونوں میں ایک ادا ہے۔ مرنے والے نے کہا ناچنے کا لفظ صوفی کی توہین ہے۔ میں بولا سب مہذب ناچتے ہیں۔ بادشاہ اور بیگم تک اس لفظ پر عمل کرتے ہیں۔ پھر صوفی کو رقص میں کیا عار ہے۔ تہذیب مادی ہو۔ یا روحانی دونوں کا ایک ہی شعار ہے

ساربان ابن ساربان

تمہارے خاقان ابن خاقان وسلطان ابن سلطان کا ہم قافیہ ساربان ابن ساربان ہوں۔ اونٹ چلاتا ہوں۔ اونٹ کی محنت پر میری زندگی کا دارومدار ہے۔

دیکھو میرے پیچھے اونٹوں کی ایک قطار چلی آتی ہے۔ ہر اونٹ کی نکیل دوسرے کی دم سے بندھی ہوئی ہے اور بے چارے چپ چاپ گردن اٹھائے آگے والے اونٹ کے قدم بقدم چلا آتا ہے رستہ میں ایک منطقی صاحب ملے تھے۔ بولے کیوں بھی اونٹو! تمہاری پیٹھ پر کیا لدا ہوا ہے۔ اور تم کہاں جاتے ہو۔ سب نے کہا۔ اس کی خبر ہمارے ساربان ابن ساربان کو ہے اس نے جو کچھ لاد دیا ہے۔ ہم نے لاد لیا ہے۔ وہ جہاں لے چلے گا وہاں چلے جائیں گے۔

منطقی نے کہا۔ تم کو معلوم کرنا چاہیئے تھا۔ کہ کہاں کا ارادہ ہے۔ اور پشت پر کیا چیز لادی ہے۔ یہ سنکر ایک اونٹ نے کیا خوب جواب دیا۔ کہ آپ کے کالجوں اور اسکولوں میں جو شتر زادے کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے اور ایک دوسرے کی دم سے بندھے ہوئے جارہے ہیں۔ ان سے کبھی پوچھا کہ کہاں جاؤ گے۔ اور تم پر کیا لدا ہوا ہے۔

تم کو پہلے اپنے گھر کے شتران بے مہار کی خبر لینی چاہیئے۔ اس کے بعد ہم جانوروں کو۔ نا منطقی صاحب لاجواب ہو گئے۔ اور اونٹ ساربان ابن ساربان کے پیچھے بڑبڑاتے چلے گئے اس وقت میں نے خیال کیا۔ کہ اس بے معنی گفتگو کے اندر ایک پھانس ضرور تھی۔ وہ پھانس کہاں سے لاؤں جو اس کو دل لگی نہ سمجھے۔ اور غور کر کے کچھ نتیجہ نکالے۔

چھُری کانٹے کی تکفین

موت تو مجھ کو یاد آئی ہے۔ آپ چھری کانٹے کے کفن دفن کا عنوان کیوں مقرر کرتے ہیں۔ آپ چھری کانٹے کا خیال چھوڑیئے۔ اور مجھ کو اول منزل پہنچایئے

صاحب میں چند گریجوایٹ لڑکوں کا اتفاقی باپ ہوں۔ اتفاقی اس لیئے کہ وہ ناخلف اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتے ہیں۔ کہ اتفاقی امر ہے کہ ہم اس وحشی کے گھر پیدا ہوگئے بڑا ہی بے تہذیب اور ناشائستہ ہے۔ اس ترقی کے زمانے میں اب تک پان کھاتا ہے۔ روئی کی کمری پہنتا ہے۔ دسترخوان پر ڈکار لیتا ہے۔ انگلیاں شوربے میں ڈبوتا ہے۔ اور پھر ان کو چاٹتا ہے۔ گھر کی اونچی اونچی دیواریں بنا کر ہوا روکتا ہے۔ مٹی کے ڈھیلے سے استنجا کرتا ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس کے بیٹے بنے۔ کاش یہ ہمارا باپ نہ ہوتا۔

بھائیو! میرے یہ چاروں بیٹوں کا خیال ہے۔ ایک ہی ان میں سے مجھے اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ ذرا انصاف کرنا۔ میں نے انکی تعلیم میں اپنی ساری کمائی خرچ کردی۔ سو روپیہ کا نوکر تھا۔ چار سو روپے اوپر کی آمدنی تھی۔ وہ سب کی سب ان کے پڑھنے میں جھونک دی۔ آپ روکھی سوکھی کھائی۔ موٹا جھوٹا پہنا۔ کوڑی کوڑی بچائی پیسہ پیسہ جوڑا۔ اور ان کو علی گڑھ میں پڑھوایا خیال تھا۔ کہ ہم بڈھے ہونگے۔ تو یہ بڑے بڑے عہدے پائیں گے۔ اور ہماری خدمت بجا لائیں گے انپر خرچ کرنا گویا بینک میں روپیہ جمع کرنا ہے۔ ایک دن معہ سود کے سب وصول ہو جائے گا۔

مگر قصور کچھ میرا بھی ہے۔ ان کے ہوش سنبھالتے ہی انگریزی سکول بھیجدیا۔ چاہیئے تھا کہ پہلے قرآن شریف پڑھواتا۔ مذہبی مسائل سے آگاہ کرتا۔ بزرگوں کے ادب آداب اور خدمت کے طریقے بطور تربیت کے ذہن نشین کرتا۔ پر مشکل یہ تھی۔ کہ رات دن علی گڑھ والوں کے لیکچر سنتا تھا۔ کہ دیسی مکتبوں میں ڈال کر اور بے سرد پا کتابیں پڑھوا کر عمر برباد کردی جاتی ہے۔ ان بیچاروں کا دماغ تو پہلے ہی قرآن یاد کرنے میں خرچ ہو چکتا ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں آکر وہ کیا خاک

پائیں گے اس لیے ضرورت ہے کہ شروع ہی سے ان کو انگریزی میں لگایا جائے۔ تاکہ چال ڈھال میں ابتدا سے انگریزیت کا اثر قایم ہو جائے۔

میں بدنصیب ان لیکچراروں کے جادو میں آگیا۔ اور ہائے میں نے کچھ آگا پیچھا نہ دیکھا میں نے اپنے چار نونہال برباد کر دیئے۔ لوگو! میں لٹ گیا۔ میری اولاد اور مال دونوں ہاتھ سے گئے۔ اس پر طرہ یہ کہ ان کو دیکھ دیکھ کر جی جلتا ہے۔ ان باتوں سے طبیعت کھولتی ہے۔ لیکن کیا کروں کچھ بس نہیں چلتا۔

ایک صاحبزادے جج ہیں ۹ سو پاتے ہیں۔ دوسرے انجنیر ہیں سات سو کی تنخواہ ہے۔ تیسرے ای۔ اے۔ سی۔ چار سو کے تنخواہ دار ہیں۔ چوتھے کمیٹی کے سکرٹری ہیں۔ دو سو ماہوار او بالائی یافت الگ۔ خرچ دیکھو۔ تو الامان۔ ایک بھی ان میں ایسا نہیں جو مہینے پر دو پیسے بچا سکتا ہو۔ تنخواہ آنے میں جب چار دن رہ جاتے ہیں۔ تو ان کی گذر قرض پر ہونے لگتی ہے نہ انہوں نے کوئی زمین مول لی ہے۔ نہ مکان خریدا ہے۔ نہ کوئی ایسا کپڑا بنایا ہے۔ جو بازار میں فروخت کرنے جاؤ۔ تو آدھے دام تو مل جائیں۔ نہ ان کے پاس ایسے برتن ہیں جنکی چوتھائی قیمت وصول ہو سکے۔ حیران ہوں یہ ہزاروں روپے کہاں غارت ہوتے ہیں۔ مجھ کو نہ دیں تو آپ تو فارغ البال رہیں۔ جب سنتا ہوں خرچ سے تنگ سنتا ہوں۔ لہذا میں نے تیاری کرلی کہ مر جاؤں چنانچہ بادل ناخواستہ مر گیا۔

خیال تھا۔ کہ میرے مرنے میں یہ ضرور آئیں گے۔ آخر کو تو ان کا باوا ہوں ضرور دل پسیجے گا مگر افسوس کہ میں اپنی جان سے گیا۔ تب بھی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ ایک لخت جگر نے مرنے کی خبر سنکر اپنی ماں کو تار دیا بہت افسوس ہوا مجھ کو صاحب نے رخصت نہ دی اس لیے میں نہیں آسکتا۔

دوسرے کا تار آیا۔ آج میرے ہاں دوستوں کی دعوت ہے۔ آنے کی فرصت نہیں۔ باقی دو نے بالکل گھنی ساد ھ لی۔

اس بدلنے زمانے والی عورت کو دیکھو۔ اس نے مجھے ایک رات دن پڑا رہنے دیا۔ کہ میرے

بچے آجائیں، تو کفن دفن ہو۔

بڑے لڑکے کو بھی تار دیا گیا۔ تو وہ اسوقت تشریف لائے۔ جبکہ محلہ کے رضائی اوڑھنے والے لمبی ڈاڑھیاں لٹکائے بیرے جنازہ کو قبرستان لیے جاتے تھے۔ صاحبزادے صاحب گھر میں آئے چرٹ منہ سے نکال کر ماں سے کہا۔ ماما سے کہو چاء بنائے۔ راستے میں بہت سردی تھا۔

ماں بولی! بیٹا باپ کو قبرستان لے جاؤ۔ موئی چاء کا خیال چھوڑ دو۔ یہ سنکر نورچشم نے تیوری چڑھائی اور فرمایا میں کسی کے لیے اپنی تندرستی خراب نہیں کر سکتا۔

آخر لوگوں کے سمجھانے سے میت کے ساتھ ہوئے۔ مگر کندھا نہ دیا۔ نہ لاش کے قریب آئے کیونکہ ان کو چھوت لگ جانے کا ڈر تھا۔ بلکہ لوگوں سے کہا۔ کہ جنازہ گلیوں میں سے لے چلو کیونکہ ان کو شارع عام پر چلنے سے شرم آتی تھی۔ کہ سوائے ان کے مجمع میں کوئی پتلون پوش نہ تھا بس ایسے ناشائستہ گروہ کے ساتھ چلنا انکی انسلٹ تھی۔ جس کو توہین بھی کہتے ہیں۔

قبرستان جاکر محلہ والوں نے آواز دی۔ کہ آپ میت کو قبر میں اُتاریئے۔ یہ آپکا فرض ہے۔ اُنھوں نے کہا۔ نو نو۔ ملازم لوگ اُتارے گا میں ان کو انعام دے گا۔

مسلمان مسکرا کر چپ ہو رہے۔ اور اُنھوں نے مجھے قبر میں کھینچ کر ڈال دیا۔

اب صاحبزادے گھر تشریف لائے۔ اور ماں سے کہا گھر کے سب کپڑے جلا دو۔ مکان میں سفیدی کراؤ۔

ماں بولی! دُوئی کیوں۔ بلند اقبال نے جواب دیا۔ اس لئے کہ۔ بیماری کی چھوت جاتی ہے۔

ماں نے کہا۔ نا بابا مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ کپڑے ان کی نشانی ہیں۔ میں ان کو آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دونگی۔ اور نہ سفیدی کرانے کا یہ موقع ہے۔ کوئی کیا کہے گا۔ کہ مرتے دیر نہ ہوئی اور ان کو آرایش کی سوجھنے لگی۔

اس جواب سے نونہال کو بڑا غصہ آیا۔ اور رات کو ہوٹل میں جاکر سوئے۔ اور صبح کو

نوکری پر چلے گئے۔

ہائے میں ناحق مرا۔ کاش میں نہ مرتا۔ اور اپنی بڑھیا کو خاک بسر نہ کرتا۔ اس غریب کا کیا حال ہو گا۔

نئی روشنی کی اولاد سے توقع نہیں ہے۔ اے لوگو! جو اس بیان کو پڑھتے ہو۔ اگر تم اپنے بچوں کو انگریزی پڑھاؤ ؛ تو پہلے انکی مذہبی تربیت اچھی کر دینا۔ اور ان کو ماں باپ کے حقوق بچپن میں سکھا دینا۔ ورنہ یاد رکھو کہ ان کے چھری کانٹے تمہارے گوشت پوست کو کاٹ کاٹ کر کھا جائیں گے۔ اور تمہارا بھی وہی حال ہو گا۔ جو میرا ہوا۔

قبر میں بھی چین نہیں جس اولاد کی خاطر رشوت لی تھی۔ وہ اولاد ایسی نکمی نکلی۔ اور رشوت کے عوض سانپ بچھو مجھے لپٹے۔

لعنت ہے میرے کردار پر۔ لعنت ہے۔ میری غفلت پر ، اور نفرت اس تہذیب جدید پر ، مگر یہ لعنت و نفرت محدود ہے۔ کیونکہ نہ سب بیٹے ایسے ہوتے ہیں۔ اور نہ سب مجھ جیسے باپ ؛

سات سو پچاس ناقص کانگریس میں

جس کے آدھے بھی ناقص ہوتے ہیں۔ اور وقت ضرورت نہ کام آسکتے ہیں نہ سند ہو سکتے ہیں۔

مسٹر پریسیڈنٹ لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ جو کانگریس کے پنڈال میں حاضر تھے۔ مجھ کو معاف کریں۔ کہ میں اپنی کانگریس کی حیثیت سے نہیں ، بلکہ ایک کٹ ملا نیم وحشی کی پوزیشن میں کانگرس کی اس کامیابی پر تنقید کرنی چاہتا ہوں جس کی مسٹر واچا نے بہت تعریف کی ہے۔ اور جس کو ملک کی خوش نصیبی سے تعبیر کیا ہے۔

اور وہ یہ ہے کہ اب کے کانگریس میں سات سو پچاس عورتیں بھی شامل تھیں

ہم لوگ عورتوں کو ناقص العقل کہتے ہیں۔ لہٰذا کہنا چاہیئے۔ کہ ساڑھے سات سو ناقص العقل

اس مجمع کانگریس میں موجود تھے۔ مگر ہنوز یہ معلوم نہیں ہوا۔ کہ ووٹ لیتے وقت ان ناقص العقل

کو بھی درج شمار کیا گیا یا نہیں۔ اگر نہیں کیا گیا۔ تو ہوم رول حاصل کرنے کے بعد انڈین سفرجیٹ

کے حفظ ماتقدم کی کوئی تجویز پاس ہوئی یا نہیں۔ کیونکہ جب ابتدا میں عورتوں کو اسقدر دلچسپی کا

سے ہے۔ تو وہ وقت دور نہیں۔ جبکہ

لیڈی لیگ

قایم ہوگا۔ اور مردوں سے مساوات کے حقوق طلب کئے جائیں گے۔

ہوم رول لیگ کی تجویز پاس ہو۔ یا نہ ہو۔ لیکن عورتوں کی سیاسی دلچسپی سے تو تعج

ہے۔ کہ ہندوستان میں ہوم رول زیادہ فروخت ہوا کریگے۔ کیونکہ تعلیم یافتہ عورتیں مردوں کے

قلم کا مقابلہ بغیر رول اُٹھائے نہ کر سکیں گی۔

خصوصاً اس حالت میں۔ کہ مسز اینی بسنٹ نے ہوم رول کا مسئلہ اُٹھایا ہے۔ اور بسنٹ

صاحبہ باعتبار جسم عورت ہیں۔ پس مستورات کہہ سکتی ہیں۔ کہ ہوم رول عورت کی سعی سے ملا

لہٰذا عورتوں کا حق مردوں سے دگنا ہونا چاہیئے۔ ایک مردوں کی برابری میں۔ دوسرا اس صلہ

ہیں۔ کہ عورت نے ہوم رول حاصل کیا۔

کیا معلوم نہیں۔ کہ مرد سالہاسال سے کانگریس کے خیمہ میں غل مچایا کرتے تھے۔ کچھ سن

نہ ہوئی۔ بسنت دیوی کھڑی ہوئیں۔ تو ہوم رول مل گیا

ہم جاہلوں کے عقیدہ میں تو عورتوں کا مردوں کی برابر آنا نہایت خطرناک ہے۔ سرکار کو

چاہیئے۔ کہ وہ اسکول و کالج کے طلباء کی طرح عورتوں کو بھی پالیٹکس کی شرکت سے منع کردے

ورنہ سوشل اور خانگی انتظامات میں بہت خلفشار پڑ جائیں گے۔

آسمانی چوڑیاں

کانگریس بیچاری مانگتے مانگتے تھک گئی۔ اور اس کو ایک چاقو بھی نہ ملا۔ مستانوں نے چوڑیاں پہن لیں تو کوئی محروم نہ رہا۔

لیگ و کانگریس کے نمائشی مردانے ان مستانوں کو زنانہ کہیں گے۔ کہیں، جو منہ میں آئے بکیں۔ مستان الست ان دعوے داران مردمی کو کب خاطر میں لاتے ہیں۔ کیونکہ ان کو نظر آتا ہے۔ کہ ان سب کے ہاتھ آسمانی سہاگ کی چوڑیوں سے ننگے ہیں۔

ذرا دیکھو ان متوالوں کو، جنکو آسمانی سوہاگ کی چوڑیاں ملی ہیں۔ اپنے پیا اپنے سیاں اپنے ساجن اپنے پتی پر کیسا توکل رکھتے ہیں۔

یہی اعتماد ان کا سہاگ ہے۔ پیا کو چاہتے ہیں۔ پیا ان کو چاہتا ہے۔ وہ ساجن انکے گھونگٹ کی لاج رکھتا ہے۔ اور اس لاج کو بچانے کے لیے تلوار کھینچے کھڑا رہتا ہے۔

لیگی اور کانگریسی۔ رنڈاپے کی صورتوں کو بھی دیکھنا۔ ہر ہر گھر کی آبادی کو دیکھ کر ٹھنڈا سانس بھرتی ہیں۔ پرائے ہاتھ کی مہندی مانگتی ہیں۔ دوسروں کے شوہروں پر جان دیے دیتی ہیں۔

اے آسمانی چوڑیاں پہننے والی سہاگن روحو۔ خبردار رہنا۔ اپنے واحد و یکتا خاوند کے سوا کسی غیر کا خیال دل میں نہ لانا۔ ورنہ تم بھی لیگ و کانگریس کی بیواؤں کی طرح ہرجائی بن جاؤگی اور تمہارا پتی تم سے بیزار ہو کر تم سے آنکھیں پھیر لیگا۔ جیسا کہ اس نے ان لیگیوں سے نظر اٹھالی اور بمبئی میں ساری رسوائیاں انپر ختم کر دیں

واہ واہ واہ۔ کیا ہی پیاری ہیں۔ آسمانی چوڑیاں۔ عاشق کو معشوق بناتی ہیں۔ معشوق کو عاشق دلواتی ہیں۔ سہانی ہیں۔ رنگیلی ہیں۔ البیلی نکی نویلی ہیں۔ لے لو آسمانی چوڑیاں۔ پہن لو آسمانی چوڑیاں

بسنتی جسم پر ان آسمانی چوڑیوں کی بہار ہے۔ آؤجی بہنو یہ پھول بے خار ہے۔ خدا کا بچہ پر پیار ہے۔ مانگو مانگو آسمانی چوڑیاں۔

مرچ نامہ

پرانا قلعہ ہی نہ رہا۔ جہاں کی لال مرچیں دلی میں مشہور تھیں۔ اور پھیری والے کنجڑے پرانے قلعے کی آواز لگا کر مرچیں بیچا کرتے تھے۔ کہنے کو قلعہ اب بھی موجود ہے۔ لیکن اس کے آس پاس کی زمین جہاں مرچوں کی پیداوار تھی۔ نئی دلی کے نقشے میں آگئی۔ اور کھیتی کیاری کا نقشہ قلعے کے قریب بالکل مٹ گیا،

خدا کی مار منہ میں آگ لگ گئی، آنکھیں پانی میں ڈوب گئیں یہ سالن ہے۔ یا مرچوں کا اچار دلی والے خبر نہیں اتنی مرچیں کیوں کھاتے ہیں۔ دکن مدراس اور دلی کے سوا ساری دنیا میں مرچوں کی اتنی زیادتی نہیں ہے۔ کہیں تو کالی مرچوں کا رواج ہے۔ کہیں سرے سے مرچ کھاتے ہی نہیں، مگر دلی، الٰہی تیری پناہ، سالن میں لال مرچ نہ ہو۔ تو دلی والے اس کی صورت پہ نام دھرتے ہیں۔ نیلی پیلی شکل بتاتے ہیں۔

دلی والے ہری مرچیں، روکھی کھاتے ہیں۔ نیبو میں کتر کر کچومر بناتے ہیں۔ اچار میں ڈالتے ہیں۔ لال ہو جائے تو دال سالن اس ہی سے پکتا ہے۔ سالن کی لال لال رنگت کی تعریف کی جاتی ہے۔ جو مرچ کی تیزی سے ہر وقت سرخ رہتا ہے۔

لال مرچ کا پودا

دو ڈیڑھ فٹ اونچا مرچ کا درخت ہوتا ہے۔ ڈالیاں گنجان پتے ٹہنی کی برابر نوک دم۔ مرچ شروع میں بڑی پیاری معلوم ہوتی ہے۔ انگل بھر کی سبز چکنی پاؤ انچ موٹی۔ جڑ کی طرف سے چوڑی منہ کے پاس سے پتلی۔ زمین کیطرف آنکھیں جھکائے رکھتی ہے

چند روز میں، بڑھتے بڑھتے، دو انچ۔ ڈھائی انچ کی لمبی ہو جاتی ہے۔ بچپن کی سبزی جوانی

کا سرخ بناس پہنتی ہے۔ اور ہرے ہرے درختوں میں لال لال مرچیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے سبز ساٹن میں لال لال پھول، یا روشنی کے سبز جھاڑ میں سرخ رنگ کی قلمیں لٹکا کرتی ہیں۔

بچارا درخت تو اول سے آخر تک سبز ہی رہتا ہے۔ خبر نہیں مرچ میں یہ جوانی کہاں سے آجاتی ہے، کہ مرتے دم تک لال رہتی ہے۔ شاید مرچ کے درخت کا جگر بھی لال ہو گا۔ اور اس نے اس کو کاٹ کر مرچیں بنائی ہونگی

مرچیں توڑ کر آتی ہیں۔ تو ڈوروں میں پرو کر اور ہار بنا کر، یا یونہی چھتوں اور سوکھی زمین پر پھیلا کر ان کو سکھا لیتے ہیں۔ پھر کیا مجال دھوپ سے اس کے رنگ و روغن میں فرق آتا ہو۔ سوکھ کر مرجھا جاتی ہے۔ مگر چہرہ ویسا ہی لال دمکا کرتا ہے۔ بلکہ کھال میں ایک طرح کی چمک اور شفافی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس میں سے اس کے اندر کے بیج نظر آیا کرتے ہیں

مرچ کے پیٹ میں بہت سے بچے یعنی بیج ہوتے ہیں۔ اور انکی شکل زرد اور گول گول بالکل سونے کی گینوں کی سی ہوتی ہے۔

مرچ کے نقصان

مرچ کھانے کی چیز نہیں ہے۔ اس کو تو کھیت میں دیکھنا چاہیے۔ مگر خلقت کھاتی ہے۔ لال مرچ معدہ کو، جگر کو، مثانہ کو، دل و دماغ کو بے حد مضر ہے۔ مردوں کے مخصوص امراض اسی لال مرچ سے پیدا ہوتے ہیں۔ مرچ انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ اس کا نقصان بہت آہستہ آہستہ ہوتا ہے۔ اور معلوم نہیں دیتا۔ مرچ بھی افیم اور شراب کیطرح منہ کو لگ جائے تو مشکل سے چھوٹتی ہے۔

مجھی کو دیکھو۔ اس کے دلدادوں میں ہوں۔ آٹھ دن ہوئے بالکل چھوڑ دی ہے۔ اور دیکھتا ہوں۔ کہ اس کے ترک نے میری صحت کو بے حد فائدہ پہنچایا۔ لیکن حالت یہ ہے کہ فراق مرچ میں اچور ہوا جاتا ہوں "وہ لال جوڑے والی جس کے سر پر سبز رومال بندھا ہوا

تھا۔ ہر وقت نظروں کے سامنے رہتی ہے۔ کھانا سامنے آتا ہے۔ تو روح اس کے دیکھنے سے
انکار کرتی ہے۔ اور ہتیلی کی لال پری کے بغیر نوالہ حلق سے نہیں اُترتا
کچھ ہی ہو۔ بات ہے تو سب کچھ ہے۔ اب تو جو عہد کر لیا۔ خدا نے چاہا۔ تو اس فتنی کو
کبھی منہ نہ لگاؤنگا۔ ہندوستانی ہوں۔ مگر بائیکاٹ میں ہندوستانی نہیں ہوں۔ جو کہتا ہوں
اس سے ایک انچ اِدھر اُدھر نہیں ہوتا۔
بی مرچ کو چھوڑ دیا۔ طلاق دیدی برسوں ساتھ رہی تھی۔ اس واسطے اس کی یادگار میں
یہ مرچ نامہ لکھا ہے۔ کہ مجھ کو بے وفا نہ کہے۔

مرچ کی صوفیانہ شان

ذرا دل کے مسالہ کا بھی خیال رکھنا۔ جو بات کہو جو لفظ زبان سے نکالو صوفیانہ نکتہ اس
میں ضرور تلاش کرو۔ مرچ کی وداع کے وقت میں نے اسپر بھی عمل کیا۔ اور سوچا تو واہ واہ مرچ
کی عجیب ادا پائی انسان کے افعال اس کے لباس کی تبدیلی سے بدل جاتے ہیں۔ عمدہ لباس
تکبر سکھاتا ہے۔ ادنیٰ لباس خاکساری کیطرف لے جاتا ہے۔
مگر مرچ جب ہری تھی۔ سبز کپڑے پہنتی تھی۔ جب بھی اس میں تیز مزا تھا۔ اور جب متوالی
ہوئی۔ لال برقعہ پہنا۔ اس وقت بھی تیز رہی۔ تر تھی جب بھی تیز، خشک ہوئی جب بھی تیز،
آدمی زمانے کی چلپلش سے کملاتا ہے۔ تو خدا کو بھول جاتا ہے۔ اپنے اخلاق حسنہ کو مٹاتا ہے۔
مرچ ایسی نہیں ہے۔ اول شروع سے آخر تک مستقل زندگی بسر کرتی ہے۔ اور یہی استقلال یہی
یکسانی ثبوت ہے اس بات کا۔ کہ مرچ ایک خدا رسیدہ چیل ہے۔ اور مغروروں کی ناک میں
اس کی دہانس گھسکر وہی کام کرتی ہے۔ جو مچھر نے نمرود کا کیا تھا۔
مرچ میں مفید خواص بھی ہیں۔ اگر اس کا استعمال قدرتی ہدایت کے موافق ہو۔ ورنہ
وہ شان قہاری کا نباتی ظہور ہے۔

لال رنگ کی یاد

چمن میں گل لالہ نہ رہا، بہار سے لالہ رخ اُٹھ گیا۔ چہرے پر ذرا سی سرخی رہ گئی تھی۔ کیونکہ
ربت کے سبب اکثر پیدل چلتا تھا۔ اس کو ٹریم کار نے کھو دیا۔ دس قدم جاتا ہوں، تو ۱۲ منٹ ٹریمو
ی راہ دیکھتا ہوں۔ سوچتا ہوں میرا چہرہ زرد کیوں ہوتا جاتا ہے۔ گلوں کی لالی دن بدن گھٹتی
لی جاتی ہے۔

ڈاکٹر انصاری سے پوچھوں؟ انہوں نے تو لال ٹوپی۔ لال خیال۔ لال منہ کے ترکو
علاج کیا۔ شاید وہ اس کی وجہ بتائیں۔ مگر ان سے بات کرنے کے چار روپے لگتے ہیں۔
حاذق الملک" سے دریافت کروں، تو وہ گھر پر نہیں ملتے۔ سفر میں زیادہ رہتے ہیں۔
خدا کی شان ہے جو لال قلعہ کے نیچے رہے۔ اندلس کی الحمرا کی دید کا عاشق ہو۔ وہ اپنی
ن کی لالی سے بھی محروم کر دیا جائے۔

بازار میں جاتا ہوں پنجرے میں لال بچے دیکھتا ہوں۔ انکی لال چونچ سے خدا کی حمد
تی پاتا ہوں۔ مگر وہیں زرد چہرے آدمیوں کے نظر آتے ہیں۔

پوچھو۔ کیوں بھئی لال جانوروں میں تم زرد آدمی کیسے رکھتے ہیں لڑائی نے لال رنگ مہنگا
ر دیا۔۔۔۔ چالیس گنے دام بڑھ گئے ہیں۔ اب ہمارے لیئے نہ لال پگڑیاں ہیں نہ عورتوں کے
سطے لال دوپٹے۔ لباس لال میسر نہیں تو جسم کے اوپر سرخی کہاں سے آئے۔

دلی میں نئی سڑکیں بنتی ہیں، تو ان پر لال بجری پھیلائی جاتی ہے۔ کہ چلنے والوں کا دل اس
خ دید سے خوش ہو۔ میدان جنگ میں بہادر خون کی سڑکوں پر پھرتے ہیں، تو بلغ بلغ ہوتے
، "تم لال بجری پر چلو، اور جی خوش کرو۔

"لالی" پیروں کے تلے ہے تو کیا لطف۔ مزا تو جب ہے کہ بدن میں لالی ہو چہروں
سرخی ہو۔ اور یہ کھانے پینے کی بے فکری سے ہوتی ہے۔ اتفاق و اتحاد سے ہوتی ہے یہاں گرانی

کے سبب پیٹ ..... بھر اور روٹی نصیب نہیں ہوتی، اور اتفاق کیسے ہو۔ خون بھی تو سفید ہوگیا ہے۔

البتہ ایک وجہ خوشی کی پیدا ہوئی ہے۔ مگر وہ بھی چند دن کی مہمان نظر آتی ہے۔ لڑائی کے بعد کاغذ سستا ہوجائے گا۔ تو کافور ہوجائے گی۔ اور وہ ملکی اخباروں کی سرخروئی ہے جس اخبار کو دیکھو لال رنگ کے کاغذ پر چھپتا ہے۔ باطن میں سب کے پھوٹ ہے۔ مگر ظاہر میں سب ایک رنگ معلوم ہوتے ہیں۔ لال گھوڑا۔ لال جوڑا۔ گر خود سوار کالا نیلے ہاتھ پاؤں کا۔

کہتے ہیں۔ محرم کے خون نے شفق کو لال بنا دیا۔ میں نے بھی محرم نامہ لکھا ہے۔ دیکھوں اس کا اثر میرے منہ پر بھی آتا ہے۔ یا میں آسمان کے کناروں سے بھی گیا گذرا رہتا ہوں۔

دل کے خوش کرنے کو غالب نے خوب اشارہ کیا۔ کہ میاں زرد ہو۔ تو عشق کے علم بردار ہو۔ دیکھتے نہیں نظام حیدر آباد نے ڈاکخانہ کے صندوق الخطوط (لیٹر بکس) کا رنگ بھی زرد رکھا ہے چہرہ زرد ہوگا۔ تو چین و جاپان کے ملکوں میں ایک نہ ایک دن تم کو بھی حصہ ملے گا۔ کیونکہ ان ملکوں کے باشندے سب زرد رو ہیں۔ ہم رنگی کی مثال گورے شخصوں میں دیکھی ہے۔ کہ ریل کی گاڑیاں تک ان کو مخصوص ملتی ہیں۔ تو کیا تمہارے زرد چہرے کی رعایت جاپانی اور چینی نہ کرینگے۔

لیکن میرا دل اس بے جوڑ بات سے خوش نہیں ہو سکتا۔ میں تو لال رنگ کی یاد کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑوں گا۔ کہ لالہ سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔

انار کسٹ چیونٹی

دغا بازی سے جو ستائے انارکسٹ ہے۔ مجھے خبر ہوتی۔ کہ لال چیونٹی کے ہاتھوں مجھ کو اس قدر اذیت ہوگی۔ تو میں لال رنگ کی صورت سے بیزار ہوجاتا۔ حالانکہ میں نے برسوں اسکی

یاد میں ایک الفت نامہ لکھا تھا

لال چیونٹی بہت خطرناک جانور ہے۔ سنتے ہیں لارڈ کچنر بلی سے ڈرتے تھے۔ اگر ان کو لال چیونٹی سے سابقہ پڑتا۔ تو وہ بلی سے زیادہ اس منحوس جانور کو بائیکاٹ کرتے

کالی چیونٹی دبتی ہے۔ تو کاٹ کھاتی ہے۔ نہیں تو بے غرض اپنی معاش کی تلاش میں دوڑتی پھرتی ہے۔ یہ موذی "نمل الاحمر" یعنی چیونٹی خواہ مخواہ انسان کی دشمن ہے۔ آتی ہے اور چپکے چپکے گردن میں یا بغل میں جا کر اپنا زہریلا ڈنک مارتی ہے۔ ڈنک کیوں کہوں وہ تو منہ سے کاٹتی ہے کم بخت میں ایسا زہر ہے کہ ذرا ذرا ڈال دیتی ہے جس سے غریب آدمی بہت دیر بے کل رہتا ہے۔ اس سے پوچھو۔ کہ بغل اور گردن سے تجھ کو کیا عداوت ہے۔ پاؤں کو چھوڑ کر وہاں کیوں جاتی ہے۔ مگر جواب کیا دے گی۔ انارکسٹ کا شیوہ یہی ہے کہ چھپ کر حملہ کرے۔ بغل اور گردن انسان کو نظر نہیں آتی۔ اس واسطے یہ شریر فتنی نظروں سے اوجھل ہو کر وار کرتی ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے۔ کہ آخر زمانہ میں تم کو چھوٹے قد چپٹی ناک کے دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ جنکی جوتیاں بالوں کی ہونگی۔

میں تو کہتا ہوں۔ ہو نہ ہو۔ وہ دشمن لال چیونٹی ہے۔ دیکھو نا قد بھی چھوٹا ہے۔ ناک بھی چپٹی ہے۔ اور جوتیاں بھی بالوں کی ہیں۔ کیونکہ اس کے پاؤں بال جیسے ہیں۔

مصیبت آسمان سے آتی ہے۔ اس پر ان لوگوں کا یقین نہیں ہے جو آسمان ہی کو نہیں مانتے۔ مگر میں ان کو قرآن انجیل توریت۔ وید۔ اور تعزیرات ہند کی قسم کھا کر یقین دلاتا ہوں کہ میرے ہاں لال چیونٹیوں کی مصیبت آسمان ہی سے برستی ہے۔ شاید چھت میں سے گرتی ہوں۔ مگر چھت بھی تو آسمان کے ماتحت ہے۔

بکمال ادب۔ محکمہ سی۔ آئی۔ ڈی سے درخواست ہے کہ وہ میرے گھر کے شریر انارکسٹوں کا کچھ بندوبست کر دے۔ جنہوں نے میرے امن میں ناواجب اور دخیلانہ مداخلت کر رکھی ہے۔ اور میں ان سے عاجز آ گیا ہوں۔

چراغ گل کردو!

عشق کا علاج

دنیا کی آدھی تکلیف عشق کے سبب ہے عشق نے انسانوں کی آدمیت کا ستیاناس کر دیا۔ طاعون اور ہیضہ کیطرح عشق کے بھی کیڑے ہوتے ہیں۔ جو ایک آدمی سے دوسرے آدمی میں پہنچ جاتے ہیں عشق کی بیماری کم نہیں ہوتی۔ بڑھتی ہی جاتی ہے۔

طبیب کہتے ہیں، عاشقی جنون کی ایک قسم ہے۔ جنون کا بھی خاص خاص حالتوں میں دورہ ہوا کرتا ہے۔ یہی حال عشق کا ہے، اس کی ترقی بھی موسموں پر منحصر ہے۔ جن میں برسات کو بہت بڑا دخل ہے،

جہاں برسات آئی۔ بادل آئے۔ بجلی چمکی۔ ابر گرجا۔ اور عشق ابلا۔ عاشقوں کا کلام اُٹھا کر دیکھ لو، ہر عاشق برسات میں جیسی بے قراری اور بے چینی کا اظہار کرتا ہے اور کسی موسم میں اتنا نہیں

اس کا کیا سبب ہے، سائنٹیفک اور فلسفیانہ طریقے سے اس پر عبور ہونی چاہیئے۔ تاکہ غریب انسان اس موذی مرض سے نجات حاصل کرے۔

بنگال کے ایک ڈاکٹر نے دریافت کیا۔ کہ پودوں میں جان ہوتی ہے۔ تو اس کو سب نے انعامات دیئے، اس کی واہ واہ ہوئی۔ حالانکہ انسان کے ذاتی وجسمانی فائدہ کی اس معلومات میں کوئی بات نہیں ہے۔

میں نے جو عشق کی نسبت معلومات حاصل کیں ہیں، وہ بہت مفید ہیں، اور آدمی ایک عظیم الشان تاریخی مرض سے بچ سکتا ہے۔ اگر میرے بتلائے ہوئے راستے پر وہ چلے

میں دیکھونگا۔ کون کون لوگ میری اس تحقیقات کی داد دیتے ہیں، مگر مجھے امید نہیں ہے کہ ایک شخص بھی میری اس محنت کیطرف متوجہ ہوگا۔ کیونکہ میں نے بنگالی ڈاکٹر کیطرح انگریزی نہیں

پڑھی۔ ڈاکٹری کا امتحان نہیں دیا۔ کوٹ پتلون نہیں پہنتا۔ پھر مجھے کیا حق ہے کہ ایجاد و اختراع اور معلومات سائنس کے زمرہ میں دخل دوں۔ کیونکہ بغیر لوازمات مذکورہ کے کوئی آدمی نئی بات معلوم کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔

خیر اگر کوئی میری تعریف نہ کرے، نہ سہی۔ میں تو ملک کے سامنے اپنی دریافت جدیدہ و انکشاف عجیبہ پیش کئے دیتا ہوں اور وہ یہ ہے۔ کہ:۔

برسات کے کیڑے عشق کا مرض پھیلاتے ہیں۔ یہ وہ کیڑے ہیں جو رات کو چراغوں اور لیمپوں پر پروانہ وار آیا کرتے ہیں۔ یہ اصل میں آتے ہیں اپنے مرض عشق کی خاطر مگر ان کے اثر سے ہمارے گھروں میں بھی عشق پھیل جاتا ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ برسات میں کوئی شخص چراغ نہ جلائے۔ سب لوگ اندھیرے میں رہا کریں۔ اگر چند سال اس پر عمل درآمد ہو گا۔ تو دنیا سے مرض عشق جاتا رہیگا۔ دنیا سے نہ جائے تو کم از کم انسان تو اس میں مبتلا نہ ہوا کرینگے۔ کیونکہ عشق پھیلانے والے کیڑے جنگل میں رہیں گے۔ روشنی نہ ہوگی۔ تو آبادی میں نہ آئیں گے۔

یہ گھر میرا یا چڑے کا

حضرت سلیمان علیہ السلام کو ان جانوروں سے کچھ محبت ہوگی مجھے تو انکی شرارتیں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ جب دیکھو ایک نہ ایک سر پر موجود۔ کبوتر صاحب ہیں غٹرغوں، غٹرغوں کرتے چلے آتے ہیں۔ تو تر و صاحب ہیں۔ ہُر ہروں ہُر ہروں ہنکارتے صحن میں اچکتے پھرتے ہیں آگے آگے بیگم صاحب ہیں، پیچھے پیچھے گلا پھلائے دم جھکائے نواب صاحب ہیں۔ انکی دل لگی ہوتی ہے یہاں جی کو خفقان ہوتا ہے۔

اور کبوتر تو اس قدر سٹھیا گیا ہے۔ کہ جو دیکھتا ہے۔ غریب سید کہتا ہے۔ کرتوت کی خبر نہیں۔ اس طاق میں جا اس طاق میں بیٹھ، یہاں پھر پھڑا، وہاں اودھم مچا۔ کسی پہلو قرار نہیں ہے۔

میں نے دفعہ کہا، بھائی یہاں تو نے مقبروں اور کھنڈروں کی کیا کمی ہے۔ جو تم میرے سر پر چڑھے چلے آتے ہو۔ جاؤ وہاں جاکر انڈے دو، بچے نکالو۔ اور دنیا میں اپنی بیٹ کے انبار لگاؤ۔ مگر کون سنتا ہے، وہ تو جان بوجھ کرتے ہیں۔ ان کو تو ایک سکوت پسند کے ستانے میں مزا آتا ہے۔

سب سے زیادہ بدذات یہ چڑا ہے غسل خانہ میں گھونسلا بنایا کرتا تھا۔ اب کے میں نے کہا میاں یہ موروثی جگہ نہیں ہے۔ اس دفعہ کہیں اور جاکر رہو سنے کون۔ عذر یہ کہ آدمی کی بولی نہیں سمجھتا۔ سب کچھ سمجھتا ہے۔ اشارے تک جانتا ہے۔ مگر یہ خیال کرتا ہے کہ میاں ننھی ننھی جانوں کو مار کر کھا جانے والے مسلمان نہیں ہیں۔ جتنا ہی سر چڑھیں، کچھ نہ کر سکیں گے

غسل خانہ کو ذرا دیکھو تو طاق میں سے صابن پھینکا۔ کہیں پھینکی۔ ٹب میں بیٹ کی، لوٹے میں غوطے لگائے۔ اور تولیہ کا تو دشمن ہے۔ سارے تاگے نکال ڈالے۔ اور اپنے موذی ابن موذی فرزند ارجمند کے نیچے جاکر بچھا دیئے۔

خیر میں نے صبر کر لیا۔ بچوں کا خیال کرکے چپ ہو گیا۔ وہ بڑے ہو کر اڑے تو ان حضرت نے دوسری تیاری شروع کی۔

ارے بھائی۔ کیوں دنیا کی آبادی بڑھاتا ہے۔ تجھے کیا ان چڑیا زادوں کو لڑائی پر بھیجنا ہے نہیں مانتا۔ گھونسلے میں تنکے اور پر جمع کئے جاتا ہے۔

آج آٹھ دن ہوئے۔ میں نے غسل خانہ بند کر دیا۔ دروازے کو بند دیکھ کر یہ دونوں خصم جورو کچھ دیر تو چڑچڑاتے رہے۔ اور پھر اڑ کر چلے گئے۔ میں نے کہا چلو پاپ کٹا۔ دیکھتا کیا ہوں۔ چڑے صاحب پھر موجود۔ عورت ذات ناک والی تھی۔ وہ تو نہ آئی۔ اور در کی بندش کو لیڈی کی انسلٹ (توہین) سمجھ کر اس نے ادھر کا رخ نہ کیا۔ لیکن چڑا بیچارا مغرب تک غل مچاتا رہا۔ سورج چھپا، تو جھٹ گیری میں جا گھسا۔ یہ خیال نہ کیا۔ چڑیا رات کے وقت کہاں چلی گئی۔ نازک زمانہ ہے، اکیلا چھوڑنا ٹھیک نہیں۔ مگر اس کو ملک (گھر) کی پڑی ہوئی تھی۔ بیوی کی

ں نے پروا بھی نہ کی۔ صبح ہوئی تو چڑیا۔ ایک اور چڑے کے ساتھہ آئی۔ اور منڈیر پر بیٹھ کر۔
چوں۔ چر چر۔ چوں چڑ۔ چڑ چوں چوں کی آواز لگائی۔ یہ بے غیرت جھلا کر دوڑا۔ اور چڑیا کے
ر جا بیٹھا۔ یہ نہ پوچھا۔ کہ کیوں ری ساتھہ میں یہ کون ہے۔ اور رات تو نے کہاں گذاری مگر
ں پھر وہی راز۔ وہی نیاز۔ رقیب چڑا اڑ گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد چڑیا بھی غائب ہو گئی اب
یری شامت آئی۔ سامنے آن بیٹھا۔ اور لگا طرح طرح کی آوازیں نکالنے۔ لڑتا ہے۔ گالیاں
اہے۔ کوستا ہے۔ آخر تو کہتا کیا ہے۔ میں غسل خانہ تو ہرگز نہ کھولوں گا۔

میں نے ایسا مستقل مزاج بھی نہیں دیکھا۔ برابر آٹھہ دن اس نے ایجی ٹیشن جاری رکھا۔ اور
۲۳ نومبر ۱۹۱۶ء یوم پنجشنبہ کو بوقت عصر میں نے اپنی ضد کے ہتیار چڑے کے آگے ڈال دیئے
سل خانہ کھول کر اس کو گھونسلے میں جانے کی اجازت دیدی۔

تم لوگ اس بحث میں وقت ضایع کر رہے ہو۔ کہ کانفرنس کے پریسیڈنٹ آنریبل شفیع
ں یا نہ ہوں۔ میری خبر کوئی نہیں لیتا۔ کہ یہ گھر میرا ہے یا چڑے کا۔ اور آیا اس گھر میں رہنے کی اسکو
یت ہے یا مجھ کو۔ ہائے تم میں سے کس کو اس واقعہ ہائلہ سے دلچسپی ہوگی۔

پلے کوں کوں کرتے تھے

یاں چوں چوں کرتی تھیں۔ قمری ہوں ہوں کرتی تھی۔ مرغی قوں قوں کرتی۔ سردی آئی تھی۔ میں
گرم لحاف اوڑھا تھا۔ پاؤں پھیلا کر سویا تھا۔ کتے کے پلے گلی میں پڑے ٹھٹھرتے تھے۔ انکی
ں کوں کی آواز سے میری نیند اڑ گئی۔ میلی کچیلی گیلی زمین میں کتیا اپنے بچوں کو لیئے پڑی تھی
ے اپنی ماں کے پیٹ کے سایہ میں آپس میں لپٹے ہوئے کوں کوں کر رہے تھے۔ سردی انکو
ائی تھی۔ ذات پات کی قید نے اسپر بھی یہ مصیبت ڈالی تھی۔ وہ اونچی ذات کی نہ ہوتی۔ خدا اس
ی شکل دیتا۔ تو آج کسی کوٹھی کے اندر نرم نرم بچھونوں میں آرام کرتی ہوتی پچھلے جنم کے اعمال
ں کے سامنے آئے ہیں۔ اچھوت ذات میں پیدا ہوئی ہے۔ آپ بھی دکھہ سہتی ہے۔ بچوں

کو بھی دکھ میں دیکھتی ہے۔

دیکھنا بے چاری کتیا کیسی دبلی ہو گئی ہے۔ ساری بستی میں ہڈیاں جھوٹے ٹکڑے تلاش کرنے جاتی ہے۔ کہیں سے مل جاتا ہے۔ اور کہیں سے جوتی اینٹ پتھر یا گالیاں کھاتی ہے۔ اس کو بھوک کی زیادہ پرواہ نہیں ہے۔ مگر بچوں کے دودھ پلانے کے سبب اس کو ان دنوں بھوک بہت لگتی ہے۔ کھانے کو میسر نہیں آتا۔ بھوک میں دودھ پلاتی ہے۔ تو اس کا جسم گھل گھل کر آدھا ہوا جاتا ہے۔ دن میں کسی ظالم نے پتھر مارا ہو گا۔ ٹانگ اٹھائے، اور لنگڑا کر چلتی ہے۔ اب رات کو وہ چوٹ اس کو ستا رہی ہے۔ بچوں کی کوں کوں کے ساتھ وہ بھی کبھی ایک لمبی کوں کر لیتی ہے۔

پلوں کے اندر ایک بے گناہ روح ہے۔ خوبصورت اور اعلیٰ نسل کے پلوں کی ارواح اور ان کم نسلے پلوں کی روح میں کچھ فرق نہیں ہے۔ پھر وہ کیوں عیش کرتے ہیں۔ میم لوگوں کی گود میں سوتے ہیں۔ صابن سے نہاتے ہیں۔ گائے کا دودھ اور گوشت ان کی غذا ہے۔ اشرف المخلوق انسان انکی غلامی پر مقرر ہے جو ان کو کھلاتا پلاتا۔ نہلاتا۔ ہوا خوری کراتا ہے اور اس کے عوض اپنے انسانی بچوں کی پرورش کے لئے تنخواہ پاتا ہے۔ اور یہ کم نسلے اس مصیبت میں کیوں ہیں۔ تناسخ اور آواگون ماننے والے کہیں گے۔ کہ ان کا پچھلا جنم برے اعمال پر ختم ہوا تھا اس واسطے اس جنم میں ان کو تکلیف اٹھانی پڑی جو پچھلے گناہوں کا بدلہ ہے۔

جو آواگون نہیں مانتے وہ کہیں گے کام بڑی چیز ہے۔ اعلیٰ نسل کے کتے شیر کا مقابلہ کرتے ہیں اپنے مالک کے نمک پر جان دیتے ہیں۔ اسواسطے انکی جتنی قدر ہو۔ تھوڑی ہے۔ اور یہ کم نسلا کتا تو بڑا ہی کاہل ہے۔ رات دن بھونکتا ہے۔ نیند خراب کرتا ہے۔ اور خطرہ سامنے دیکھے تو دم دبا کر بھاگ جاتا ہے۔ ایسے ڈرپوک کا یہی علاج ہے۔ کہ وہ تکلیفیں اٹھائے اور حقیر و ذلیل رہے میں تو نہ ادہر ہوں نہ ادہر مجھے تو بے کس اور غریب سے محبت ہے۔ اس واسطے ان بچارے پلوں کی تکلیف نہیں دیکھ سکتا۔ اور کہتا ہوں۔ آ کور کور کور۔ آ۔ بچوں میں تمہیں اپنے لحاف میں

بٹھاؤں ۔ میں تمہیں اپنی ادنی جانماز پر سلاؤں ۔ تم گندے سہی ۔ مگر میری نمازیں تم جیسے کیسوں پر قربان ہوجائیں ۔ ایک دل کی پاسداری ہزار نماز سے بہتر ہے ۔ اور تم تو کئی ننھے ننھے دل رکھتے ہو

اَلُ کچہری

یہ اَلُ ہی کچہری سے دامن بچائے کھڑا ہے ۔ اس کو بھی کچہری سے ڈر ہے یا چھوت لگ جانے کا اندیشہ ہے ۔ کیوں کہ اَلُ عربی نژاد ہے ۔ ہندی کچہری سے احتیاطاً اس کا تو مَس فرض ہی مگر کیا کرے اشارہ کرے ۔ کو جس طرح انگریزی میں "دی" کی ضرورت پڑتی ہے ۔ مسلمان اَلُ کو حرف اشارہ سمجھ کر کام میں لاتے ہیں ۔

اَلُ کہتا ہے وہ کچہری ۔ اس اشارہ میں بڑی بلاغت ہے ۔ بڑی ظرافت ہے ۔ کیونکہ کچہری کو ہم لوگوں نے جھوٹ بولنے کا ٹھکانا بنا رکھا ہے ۔ بڑے بڑے ثقہ لوگ جنکی ساری عمر سچ بولنے میں صرف ہوئی ہے ۔ کچہری میں جاکر جھوٹی گواہی دے آتے ہیں ۔ اور کہتے ہیں ۔ کہ کچہری میں سچ کیونکر بولیں ۔ یہ ال اس کا اشارہ کرتا ہے ۔ یعنی وہی کچہری جس میں جبہ و عمامہ کو جھوٹ جائز ہے ۔

جغرافیہ ہر کچہری کا سارے ملک میں ایک ہے ۔ کچہری ایک جزیرہ ہے ۔ جس کے آس پاس عقل و تدبیر کے پہاڑ ہیں ۔ اور بحر قانون کے سمندر ،

کچہری میں قانون انصاف کے تخم بوتا ہے ۔ مگر اہل مقدمہ اپنی چالاکیوں کا کھاری پانی دے کر اس بیج کو ہرا نہیں ہونے دیتے ۔ اسلامی حکومت کے زمانہ میں بھی کچہری کا یہی حال تھا ۔ اور جبہ جیسے دیوانے لوگ قاضیوں کے چٹکیاں لیا کرتے تھے ۔

کچہری کے جراثیم

ڈاکٹروں نے ہر جسم میں کیڑے دریافت کئے ہیں ۔ وہ ہر مرض کا سبب جراثیم یعنے کیڑوں کو بتاتے ہیں ۔ کچہری بھی ایک ہستی ہے ۔ ایک وجود ہے ۔ ایک جسم ہے ۔ اس کے بھی

جراثیم ہیں۔ اور وہ وکیل بیرسٹر اور مختار ہیں۔ کچہری کا مرض ان کیڑوں سے پیدا ہوتا ہے جس نے کبھی کچہری کی شکل نہ دیکھی ہو۔ وہ کسی وکیل یا بیرسٹر سے ملاقات پیدا کرے ایک ہی دفعہ کا ملنا اس کو کچہری کا شایق بنا دے گا۔ کیونکہ اس میں کچہری کے کیڑے گھس جائیں گے۔

ان کیڑوں کا اب تک کوئی علاج دریافت نہیں ہوا۔ یہ کیڑے ملک کے اچھے اچھے آدمیوں کو بیمار کر دیتے ہیں۔ کچہری کا مریض اور عشق کا بیمار ایک سی حالت رکھتا ہے۔ عاشقی کا مرض بھی آدمی کو گھن کیطرح کھا جاتا ہے۔ اور کچہری کی بیماری بھی انسان کا کام تمام کر دیتی ہے۔ کچہری کا چاہنے والا۔ رسیلی اور حسین آنکھ سے بیزار ہوتا ہے۔ اس کو کسی معشوق کے قد زیبا اور سخن شیریں کی ہوس نہیں ہوتی وہ دفعات قانون کے ہندسوں پر مرتا ہے۔ تعزیرات ہند کی کتاب اس کے لئے نامہ محبوب ہے۔ اسی کو سینہ سے لگاتا ہے۔ اسی کو چوم چوم کر جی ٹھنڈا کرتا ہے۔

کچہری کا دلدادہ مسٹر ایل بی کی گلی میں سو سو پھیرے کرنے میں ایک لذت پاتا ہے اس کی جان میں جان آجاتی ہے۔ جب وکیل یا بیرسٹر کی زبان سے مقدمہ کی سرسبزی کا کوئی جملہ سن لیتا ہے، کچہری کا بیمار مرتے وقت صرف ایک ہی آرزو کر سکتا ہے۔ کہ اسے کسی قانون پیشہ آدمی کا چہرہ دکھا دو۔ یا کم سے کم اس کے گھر کا سائن بورڈ (نام کا تختہ) ہی منگا دو۔

کچہری کے مبتلا کو جب موت آتی ہے۔ اور اس کے آس پاس کلمہ پڑھا جاتا ہے۔ تو اس کے کانوں میں یہ آواز آتی ہے۔

کوئی صفدر بیگ حاضر ہے !!!

اور وہ فوراً حاضر حاضر کہتا ہے۔ اور گھبرا جاتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں فرشتے اس کے سامنے آئے ہیں۔ اور خدا کی حضوری کا پیام لائے ہیں۔ کیسا ننگ اور ضبتی ہے۔ کہ منہ سے حاضر حاضر نکلتا ہے،

کچہری کا دیوانہ اخبارات میں کسی خبر اور مضمون کو نہیں پڑھتا۔ اس کی نظر مقدمات کے اشتہارات پر ہوتی ہے۔ اور جب کسی اخبار میں اپنے مطلب کی چیز نہیں دیکھتا۔ تو کہتا ہے یہ اخبار بالکل نکما ہے اور کام کی بات تو اس میں ایک بھی نہیں۔

کچہری کے شوقین جواریوں، شرابیوں اور تماش بینوں سے زیادہ اپنے شوق کے پکے ہیں۔ وہ مقدمہ بازی کسی حق کی خاطر نہیں کرتے ان کو تو جوے اور شراب کیطرح کچہری کی ایک لت ہوتی ہے جس میں انکی دولت و زندگانی خرچ ہوا کرتی ہے۔ کچہری اور مقدمہ بازی جس کی زندگی ہے۔ وہ دنیا میں سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ اور سب سے زیادہ قابل رحم ہے۔

کتاب مقدس تعزیرات ہند اور اس کے تمام دفعات مبارکہ کی قسم کچہری بازوں نے حکام کچہری کو بدنام کر رکھا ہے۔ کچہری کے عشاق اپنے توڑ جوڑ سے قانون کو سیدہا راستہ نہیں چلنے دیتے۔

ضرورت ہے ڈاکٹروں کی جو ال کچہری کو محکمہ حفظان صحت کے اصول کے ماتحت لاکر کچہری پرستوں کے ٹیکہ لگوائیں۔ اور وبائے کچہری سے انکی تندرستی کو بچائیں۔

نیز شہروں کی میونسپل کمیٹیاں جس طرح اور اور طریقے اختیار کرکے آبادی کی صحت کو امداد دیتی ہے۔ اسی طرح مختاروں وکیلوں بیرسٹروں کو بھی قواعد صفائی میں شریک کرکے انکو شہر سے الگ آباد کریں تاکہ یہ جراثیم عام باشندوں کو کچہری کے مرض میں مبتلا نہ کرسکیں۔ جس سے ملک تباہ ہوا جاتا ہے۔

ایک لیڈر درکار ہے

یا ایک قوم

ہندوستان کے مسلمانوں کو جو گنتی میں چھ کروڑ سے زیادہ اور سات کروڑ کے قریب ہیں۔ ایک لیڈر

کی ضرورت ہے۔ دسمبر سے پہلے پہلے درخواستیں آنی چاہئیں ۔ کیونکہ مسلم لیگ کے موقع پر اس کی ضرورت ہوگی ۔ جسکا جلسہ دسمبر میں قرار پایا ہے۔

مسلمان بہت غریب ہیں۔ نقد تنخواہ نہیں دے سکتے۔ البتہ کئی کروڑ تالیاں ۔ ہیر پھیر لکڑیوں کی کھٹ کھٹ بوٹوں کی پھٹ پھٹ ، سروں کی جنبش ، ٹوپیوں کی گردش ۔ انعام دی جائے گی ،

لیڈر مستقل درکار نہیں ہے ۔ جس کو کرسی لے کر واپس دینے میں عذر نہ ہو وہ درخواست کرے ، کیونکہ مسلمان دوامی لیڈر کو پسند نہیں کرتے ۔ جس طرح ان کے خیالات بدلتے رہتے ہیں ایسا ہی لیڈر بدلنے والا چاہتے ہیں۔

جس لیڈر میں یہ اوصاف ہوں ۔ وہ بلا تامل عرضی دے سکتا ہے۔ (۱) کانوں سے بہرا ہو (۲) آنکھوں سے اندھا ہو (۳) اس کو نیند بالکل نہ آتی ہو (۴) اس میں عقل زیادہ نہ ہو (۵) بے اولاد ہو۔

پہلی شرط کی وجہ یہ ہے ، کہ مسلمان اس کو گالیاں دیں گے ۔ آوازہ کشی کرینگے ، اتہام لگائیں گے پس اگر اس کے کان ہوئے تو وہ دل برداشتہ ہو جائیگا ۔ اور مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کی بجائے انکی زبان بند کرنے کی کوشش کرے گا۔

دوسری شرط کا سبب یہ ہے ۔ کہ مسلمانوں کے اخبارات اس کی ہجو میں مضامین لکھیں گے اپر سخت نکتہ چینی ہوگی ۔ آنکھیں ہوئیں تو ان عبارتوں کو پڑھ کر اس کا دل بجھ جائے گا ۔ اور مسلمانوں کو اس سے نقصان پہنچے گا۔

تیسری شرط کا باعث یہ ہے ۔ کہ مسلمانوں کی قومی ضرورتوں کا ایک بڑا ڈھیر اس کے سامنے ہوگا ۔ اور وہ جب ہی پوری ہونگی ۔ کہ رات دن مسلسل کام کیا کرے ۔ نیند آتی ہوگی ۔ تو رات کے بارہ گھنٹے مسلسل فضول جائیں گے ۔

چوتھی شرط میں یہ حکمت ہے ۔ کہ عاقل لیڈر مشتبہ ہو کر جیل بھیجے جاتے ہیں یا نظربندی

کا شکار ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کی عقل اور روشنی طبع حد سے بڑھ جاتی ہے۔ اس واسطے بے عقل لیڈر چاہیئے تاکہ پبلک تو اس کو بھولا جانتی ہو۔ اور حکومت احمق کاٹ کا اُلو۔ اور تجربہ سے معلوم ہوا ہے۔ کہ بھولے اور احمق بن کر آج کل بہت لوگ کام نکال لیتے ہیں۔ مسلمانوں کو بھی کام سے غرض ہے نام سے نہیں پانچویں قید میں یہ راز ہے، کہ اولاد والے لیڈر کو بچوں کے پالنے کا تجربہ ہوتا ہے اور بچے مار دینا لاڈ پیار دو متضاد طاقتوں سے پلے ہیں۔ مسلمانوں کو ایسا لیڈر چاہیئے۔ جو باپ بن کر نہیں بیٹا ہو کر حکومت کرے۔ اولاد والا لیڈر باپ ہونے کا عادی ہوگا۔ تو بیٹے کی خصلت کہاں سے دے گا۔

اے قوم یہ چھیڑ تھی یہ چٹکیاں تھیں، دل کے چلے پھپھولے تھے، تو لیڈروں کا شکوہ کرتی ہے اپنی نظر انتخاب کو کیوں نہیں پرکھتی۔ تو ایک شخص کی ذرا سی خوبی سے اسقدر خوش ہوتی ہے کہ ایک دن میں وہ شخص آسمان پر چڑھ جاتا ہے۔ اور دوسرے دن معمولی سی بشری خطا سے تو اتنی بگڑتی ہے۔ کہ اسی آسمان نشین کو زمین کی تہ میں پھینکدیتی ہے۔ زندہ قوموں کی یہ خصلت نہیں ہے۔ وہ بہت دیر کے بعد متواتر امتحانوں کے پیچھے رائے قائم کرتی ہیں۔ نہ جلدی معتقد ہوتی ہے۔ نہ جلدی بدعقیدہ۔ میں مثالیں کیوں دوں۔ ذاتیات کے افسانے سامنے آجائیں گے۔ تو اے امت مرحوم خود ہی سمجھتی ہے کہ کتنے تیرے ہاتھ سے ابھرے اور کتنے فنا ہوگئے۔ کہا جاتا ہے تیرا حسن ترقی کر گیا تو اپنے نیک و بد کو سمجھنے لگی ہے۔ تیری رائے میں قوت اور سرکشوں کو زیر کرنے کی طاقت پیدا ہوگئی ہے

کونسل کے انتخابات جلسوں کے چبوترول اخباروں کے صفحوں پر تو میں بھی اس کا نشان پاتا ہوں۔ اور مجھ کو حراوجری سمجھنے لگتا ہوں۔

مگر جب ان کسوٹیوں کی حقیقت پر غور کرتا ہوں تو یہ پرکھ غلط ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ کسوٹیاں خود ہی ناقص اور ادھوری ہیں۔ اور انہی کو مکمل کہنا غلط ہے۔ تو اس کو کھرا کیسے کہیں گے جو ان پر رکھ کر پرکھا گیا ہو۔

میری جان لیڈر منتخب کرنے میں مغرب کی ریس نہ کر۔ بلکہ میں کہونگا۔ کہ ہر کام میں یورپ کی تقلید چھوڑ دینا تیری اس رائے کو زندگی بخشے گا۔ تو بناوٹی ملمعوں سے اپنے ارادوں کو سنہری نہ بنا۔ کہ طمع

جلد اڑ جاتا ہے، تیرا مشرقی خیال سنہری رہے گا۔ تو تیرے کام پختہ ہو جائیں گے، تو کونسلوں جلسوں اخباروں کے دیکھے بغیر کامی لیڈروں کو پہچان سکے گی۔ دیکھا نہیں، سنا نہیں۔ جب کوئی کونسل کا امیدوار ممبری لینے کھڑا ہوتا ہے، تو اپنا ایک قصیدہ خود ہی لکھتا ہے۔ جس میں اپنی حمد و ثنا کے ترانے گاتا ہے۔

لکھتے وقت اس کا مشرقی ضمیر اس کو ملامت کرتا ہوگا۔ کہ اپنے منہ سے میاں مٹھو بننا روایات مشرقی کے خلاف ہے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ مگر یورپ کی رسم اسے تسلی دیتی ہوگی جہاں یہ قاعدہ معیوب نہیں

پہلے پہل تونے اس کو برا سمجھا تھا۔ اب تو بھی عادی ہوتی جاتی ہے۔ اب تیرے افراد میں خودستائی کو بے عیب کہنے والے بڑھتے جاتے ہیں۔

کونسلوں میں ان آدمیوں کو بھیج جو چپ ہیں۔ جو کہتے نہیں کرتے ہیں۔ جنہوں نے اپنی ذات کو فائدہ پہنچا کر دکھایا ہے۔ وہی دوسروں کو فائدہ پہنچانے پر قدرت رکھتے ہیں۔ نہ کہ وہ جو دولت اور لفاظی کے زور سے یہ رتبہ حاصل کریں۔ لیڈر مسلمہ لکھنے سے مسلمہ نہیں ہوتے، ان کی ہوا چند دن کی ہوتی ہے۔ ان کی روشنی جلدی گل ہو جاتی ہے۔

ہم مسلمان ہیں، ہم خوددار اور انجام بین رسولؐ کی امت ہیں۔ ہم کو حریت اور قوت ارادی ورثہ میں ملی ہے۔ بس ہم کو لازم ہے، کہ جلدی کسی بات پر آمادہ نہ ہوں۔ اس کے سب پہلوؤں کو تنہائی میں سوچیں۔ اس کے ہر نشیب و فراز پر غور کریں۔ بعد ازاں جماعتوں میں مشوروں سے مدد لیں یہ نہیں، کہ ایک اخبار نے لکھا، بمبئی بہت چھوٹا شہر ہے۔ تو اس کے پڑھنے والے آمنا و صدقنا کہنے لگیں۔ دوسرا اخبار لکھے لاہور لندن سے بڑا ہے۔ تو اس کے ناظرین بے شک بے شک کے نعرے لگائیں۔

اخباروں کو اپنی زبان بناؤ، کہ وہ تمہارے منہ سے بولا کریں تم خود ان کی زبان نہ بنو۔ کہ جو انکے منہ سے نکلا تم اسی کو رٹنے لگو۔ لیڈر درکار نہیں ہے۔ آج کل قوم درکار ہے ایسی قوم جو لیڈر بناتی ہو، ایسی قوم نہیں جس کو لیڈر روپیہ خرچ کر کے، اخباروں کے حرف معرف کے پاؤں کی دوڑ اور دوستوں کی مہربانی سے کر خریدتے ہوں اور بناتے ہوں

لاکھہ ناؤ نہیں
کروڑ ناؤ

لکھنؤ کی نسبت سنا ہے پہلے وہاں نائی آباد تھے۔ اور انکی ایک لاکھہ کی بستی تھی لاکھہ نائی سے لاکھہ ناؤ ہوا۔ اور لاکھہ ناؤ سے لکھنؤ بن گیا

دسمبر ۱۹۱۶ء میں یہ لاکھہ ناؤ تمام ہندوستان کے حجاموں کا مرکز تھا۔ یعنی ہندوستان کے سب نائی یہاں جمع ہوئے تھے۔ اس واسطے اس وقت اس کا نام لکھنؤ نہیں۔ بلکہ کروڑ مُو ہونا چاہیے تھا۔

نائی اور حجام کے لفظ سے لیگ اور کانگریس کے اراکین بُرا نہ مانیں۔ کیونکہ حجام کمین پیشہ ور نہیں ہے۔ وہ انسان کے چہرے کی اصلاح کرتا ہے۔ اور لیگ و کانگریس بھی ہندوستانی چہروں کی اصلاح بنانی اپنا مقصود بیان کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ "سید القوم خادمھم" پر غور کیا جائے۔ یعنی اس حدیث پر کہ قوم کا سردار درحقیقت قوم کا خادم ہوتا ہے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ اگر وہ حجام بھی ملک ہند کا ایک حصہ ہے اور کانگریس و لیگ بحیثیت قائم مقامی فرقہ حجام کے لامحالہ نائی ہونے سے انکار نہیں کرسکتی۔ ورنہ اس کی قائم مقامی کی صداقت غلط ہو جائے گی۔ اب کے لکھنؤ میں لیگ و کانگریس کا اتحاد ہو گیا اس کی یادگار منانی چاہیئے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ اب لکھنؤ کا نام کروڑ ناؤ، رکھدیا جائے

امید ہے۔ کہ اردو کانفرنس اس کے بارے میں تار برقیاں چھپوائے گی جسطرح سینٹ پیٹرزبرگ کے بدلے پیٹروگراڈ کے تار شائع ہوئے تھے۔

مس چڑیا کی کہانی

ایک چڑے چڑیا نے نئی روشنی کی ایک اونچی کوٹھی میں اپنا گھونسلا بنایا تھا۔ اس کوٹھی میں ایک مسلمان رہتے تھے۔ جو ولایت سے بیرسٹری پاس کر کے اور ایک میم کو ساتھ لے کے آئے تھے۔ ان کی بیرسٹری کچھ چلتی نہ تھی۔ مگر گھر کے امیر زمیندار تھے۔ گزارہ خوبی سے ہوا جاتا تھا۔ ولایت سے آنے کے بعد خدا نے ان کو ایک لڑکی بھی عنایت کی تھی جو ماشاء اللہ چلتی پھرتی تھی۔ اور باپ کی طرف سے مسلمان اور ماں کیطرف سے مس بابا تھی۔

چڑے چڑیا نے کھپریل کے اندر ایک سوراخ میں گھر بنایا۔ تنکوں اور سوت کا فرش بچھایا۔ یہ سوت پڑوس کی ایک بڑھیا کے گھر سے چڑیا لائی تھی۔ وہ بچاری چرخہ کاتا کرتی تھی الجھا ہوا سوت پھینک دیتی، تو چڑیا اٹھا لاتی۔ اور اپنے گھر میں اس کو بچھا دیتی۔

خدا کی قدرت ایک دن انڈا پھسل کر گر پڑا۔ اور ٹوٹ گیا۔ ایک ہی باقی رہا۔ چڑے چڑیا کو اس انڈے کا بڑا صدمہ ہوا۔ جس دن انڈا گرا ہے۔ تو چڑیا گھونسلے میں تھی چڑا باہر دانہ چگنے گیا ہوا تھا۔ وہ گھر میں آیا تو چڑیا کو چپ چپ اور مغموم دیکھکر سمجھا میرے دیر میں آنے کے سبب خفا ہو گئی ہے۔

لگا پھدک کر چوں چوں۔ چیں۔ چرچوں۔ چرچوں۔ چیں۔ چرچوں۔ چوں، چرچوں، چرچوں۔ چوں، کرنے۔ کبھی چونچ مار کر گدگدی کرتا۔ کبھی خود اپنے پروں کو پھلاتا مٹکتا۔ ناچتا۔ اور چڑیا کی چونچ پر اپنی چونچ محبت سے رکھتا۔ مگر چڑیا اسی طرح پھولی اپھری خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے مرد ذات کی خوشامد کا کچھ بھی جواب نہ دیا۔ چڑا سمجھا بہت ہی خفگی ہے۔ مزاج حد سے زیادہ بگڑ گیا ہے۔ خوشامد سے کام نہ چلے گا۔ مجھ مرد کی کتنی بڑی توہین ہے سکے اتنی دیر خوشامد درآمد کی۔ بیگم صاحبہ نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ یہ خیال کر کے چڑا بھی منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔ اور چڑیا سے بے رخ ہو کر نیچے بیرسٹر صاحب کو جھانکنے لگا۔ جو اپنی لیڈی

کے سامنے آرام کرسی پر لیٹے تھے۔ اور ہنسی مذاق کر رہے تھے چڑے نے خیال کیا یہ آدمی کیسے خوش نصیب ہیں۔ دونوں کا جوڑا خوش و بشاش زندگی کاٹ رہا ہے۔ ایک میں بد نصیب ہوں۔ سویرے کا گیا دانہ چگ کر اب گھر میں گھسا ہوں۔ مگر چڑیا صاحبہ کا مزاج ٹھکانے میں نہیں ہے۔ کاش میں چڑا نہ ہوتا۔ اور کم سے کم آدمی بنایا جاتا۔

چڑا اسی ادھیڑ بن میں تھا۔ کہ چڑیا نے غم ناک آواز نکالی۔ چوں۔ چڑے نے جلدی سے مڑ کر چڑیا کو دیکھا۔ اور کہا چوں چل چڑ چوں چوں۔ کیا ہے۔ آج تم ایسی چپ کیوں ہو۔ چڑیا بولی انڈا گر کے ٹوٹ گیا۔

انڈے کی خبر سے پہلے تو چڑے کو ذرا سا رنج ہوا۔ مگر اس نے صدمہ کو دبا کر کہا تم کہاں چلی گئیں تھیں۔ انڈا کیونکر گر پڑا۔ چڑیا نے کہا میں اڑ کر ذرا چمن کی ہوا کھانے چلی تھی۔ جھٹکے کے صدمے سے انڈا پھسل گیا۔ یہ بیان سنکر چڑا آپے سے باہر ہو گیا۔ اس کے مردانہ جوش میں طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس نے کڑک دار گرجتی ہوئی چوں چوں میں کہا۔ پھوڑ۔ بد سلیقہ بے تمیز۔ تو کیوں اڑی تھی۔ تجھ کو چمن کی ہوا کے بغیر کیا ہوا جاتا تھا۔ کیا تو بھی اس گوری عورت کی خصلت سیکھتی ہے۔ جو گھر کا کام نوکروں پر چھوڑ کر ہوا خوری کرتی پھرتی ہے۔ تو ایک چڑیا ہے تیرا کوئی حق نہیں ہے۔ کہ بغیر میری مرضی کے باہر نکلے۔ تجھ کو میرے ساتھ اڑنے اور ہوا خوری کرنے کا حق ہے۔ آج کل تو انڈوں کی نوکر تھی۔ تجھے یہاں سے ہٹنے کا اختیار نہ تھا۔ تو نے میرے ایک انڈے کا نقصان کر کے اتنا بڑا قصور کیا ہے۔ کہ اس کا بدل کچھ نہیں ہو سکتا۔ تو نے میرے بچہ کو جان بوجھ کر مار ڈالا۔ تو نے خدا کی امانت کی قدر نہ کی۔ جو اس نے ہم کو نسل بڑھانے کی خاطر دی تھی۔ میں تو پہلے دن منع کرتا تھا۔ کہ اری کم بخت اس کوٹھی میں گھونسلا نہ بنا۔ ایسا نہ ہو۔ ان لوگوں کا اثر ہم پر بھی پڑ جائے۔ ہم بچارے پرانے زمانے کے دیسی چڑے ہیں۔ خدا ہم کو نئے زمانے کے چڑے چڑیا سے بھی بچائے رکھے۔ کیونکہ یہ ہر گھر کے رہتے ہیں نہ گھاٹ کے۔ مگر تو نہ مانی۔ اور کوٹھی میں رہونگی۔ کوٹھی میں گھر بناؤنگی یہ کہہ کر میرا ناک میں دم کر دیا۔ اب لا

میرا بچہ لا۔ میں تجھ سے لوں گا۔ نہیں تو مارے ٹھونگوں کے کچلا بنادوں گا۔ بڑی صاحب نکلیں تھیں ہوا کھانے اب بتاؤں تجھ کو ہوا کھانے کا مزا۔ چڑیا پہلے تو اپنے غم میں چپ چاپ چڑے کی باتیں سنتی رہی۔ لیکن جب چڑا حد سے بڑھا۔ تو اس نے زبان کھولی اور کہا.....

بس بس۔ سن لیا۔ بگڑ چکے زبان کو روکو۔ انڈے بچے پالنے کا مجھی پر ٹھیکہ نہیں ہے تم بھی برابر کے شریک ہو۔ سویرے کے گئے گئے یہ وقت آگیا۔ خبر نہیں اپنی کس سگی کے ساتھ گلچھرے اُڑاتے پھرتے ہونگے دوپہر میں گھر کے اندر گھسے ہیں۔ اور آئے تو مزاج دکھاتے آئے انڈا گر پڑا۔ مرے پنجہ کی نوک سے۔ میں کیا کروں۔ میں کیا انڈوں کی خاطر اپنی جوان جہان جان کو گھن لگاؤں۔ دو گھڑی باہر کی ہوا بھی نہ کھاؤں۔ صبح سے یہ وقت آیا۔ ایک دانہ حلق سے نیچے نہیں گیا۔ تم نے پھوٹے منہ سے یہ نہ پوچھا۔ کہ تونے کچھ تھورا۔ کچھ نگلا۔ یا مزاج ہی دکھانا آتا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے۔ کہ اکیلی چڑیا پہ سب بوجھ تھا۔ اب آزادی اور برابری کا وقت ہے۔ آدھا کام تم کرو۔ آدھا میں کروں، دیکھتے نہیں میم صاحبہ کو وہ تو کچھ بھی کام نہیں کرتیں۔ صاحب کو سارا کام کرنا پڑتا ہے۔ اور بچہ کو آیا کھلاتی ہے۔ تم نے ایک آیا رکھی ہوتی میں تمہارے انڈے بچوں کی آیا نہیں ہوں۔

چڑیا کی اس تقریر سے چڑا سُن ہو گیا۔ اور کچھ جواب بن پڑا بے چارا غصہ کو پی کر پھر خوشامد کرنے لگا۔ اور اس دن سے چڑیا کے ساتھ آدھی خدمت انڈے کی بانٹ کر اس نے اپنے ذمہ لے لی۔

مس چڑیا کی پیدائش

ایک انڈا تو ٹوٹ چکا تھا۔ دوسرے انڈے سے ایک بچہ نکلا جو مادہ یعنی چڑیا تھی۔ جب یہ بچہ ذرا بڑا ہوا۔ اور اس نے میم صاحبہ کے بچہ کو دیکھا۔ کہ وہ کاٹ کے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے۔ گھڑی گھڑی دودھ پیتا ہے۔ ٹب میں بیٹھ کر نہاتا ہے۔ نئے نئے خوبصورت کپڑے پہنتا ہے تو اس چڑیا زادی نے بھی باپ سے کہا

چیں چیں چیں۔ ابا مجھ کو بھی گھوڑا منگا دو۔ ابا میں بھی ٹب میں نہاؤں گی۔ ابا مجھ کو بھی ایسے رنگ برنگ کے کپڑے لا کر دو۔ چڑے نے چڑیا سے کہا۔ لے سن۔ دیکھا تم کو ٹھی میں گھر بنانے کا۔ اب لا۔ اپنی لاڈلی کے واسطے گھوڑا لا۔ ٹب منگا۔ کپڑے بنا

چڑیا نے کہا۔ دیکھو پھر وہی لڑائی کی باتیں نکالیں۔ ایک کی تو تمہاری اس کل سے جان گئی۔ یہ نگوڑی بچی ہے۔ تم اس کو بھی نہیں دیکھ سکتے۔ بچہ ہے۔ کہنے دو۔ یہ کیا جانے ہم غریب ہیں۔ اور یہ چیزیں نہیں لا سکتے۔ بڑی ہوگی تو آپ سمجھ لے گی۔ کہ چڑیوں کو آدمیوں کی چیزوں سے کیا سروکار۔ بس چڑیا نے ماں کی بات سنکر کہا۔ واہ بی اماں واہ۔ تم غریب نہیں تم چڑیا نہیں۔ تو اس امیر کی کوٹھی میں آکر کیوں رہی تھیں۔ گاؤں کی کسی چھپر میں گھر بنایا ہوتا میں تو ہرگز نہ مانوں گی۔ اور میم صاحبہ کے بچہ کی سی سب چیزیں منگا کر رہونگی۔ نہ لاؤ گی تو میں گرتی ہوں اور مرتی ہوں۔ پاپ کاٹے دیتی ہوں۔ نہ زندہ رہونگی نہ تم پر میرا بوجھ ہوگا۔

چڑے چڑیا نے گھبرا کر کہا۔ ہے ہے۔ ایسا غضب نہ کیجو۔ اچھا اچھا ہم سب کچھ منگا دینگے یہ کہہ کر اور بس چڑیا کو دلاسا دے کر دونوں نے چونچ سے چونچ ملائی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کیا۔ روتے تھے۔ اور یہ کہتے جاتے تھے۔ ہائے اچھوں کی صحبت اچھا بناتی ہے۔ اور بروں کی صحبت برا کر دیتی ہے۔ یہ ہیر سٹر صاحب اچھے سہی۔ مگر ان کی صحبت سے ہمارا تو ستیاناس ہو گیا۔ ہائے ہماری لاڈی ہاتھوں سے نکل گئی۔ ہائے یہاں تو اور کوئی چڑیا بھی نہیں جو ہمارے دکھ میں شریک ہو۔ چڑے چڑیا روتے تھے۔ اور بس چڑیا قہقہہ لگاتی تھی کہ نئے زمانے کی اولاد ایسی ہی ہوتی ہے۔

باب سوم

خالص ادب و انشاء

جمّن جولاہے کا ارتقاء

ڈاروِن نامی ایک فلاسفر نے تحقیق کیا ہے۔ کہ آدمی اصل میں بندر تھا۔ ترقی اور ارتقاء سے آدمی بن گیا۔ اب ایک ہندوستانی فلاسفر نے دریافت کیا ہے۔ کہ جرمن اصل میں جمن جولاہا تھا۔ سر پر کرگھار کھہ کر کپڑا بنا کرتا تھا۔ لیکن ترقی و ارتقا کے زور سے اس میں ایک رے کا اضافہ ہوگیا۔ اور لوگ جرمن کہنے لگے۔ کیا عجب ہے۔ کہ برلن اور بنارس میں بھی کوئی ارتقائی رشتہ ہو

پیٹرولیم کا قحط!

خبر آئی ہے۔ کہ جرمن کے ہاں پیٹرولیم کا کال ہے۔ یہ ایک تیل کا نام ہے۔ جو موٹر میں جلتا ہے۔ اس لیے خیال کیا جاتا ہے۔ کہ اب اس کو ہوائی جہاز چلانے میں بہت دقت ہوگی۔ کیونکہ ہوائی جہاز بھی اسی تیل سے اُڑتے ہیں۔

اگر یہ خبر سچی ہے۔ تو ہندوستانی افواہوں کے موجدین کو ایک خاص جلسہ میں اس لفظ پیٹرولیم پر غور کرکے بحث کرنی چاہیئے۔ تاکہ نتیجہ میں کوئی انوکھی خبر دریافت ہوجائے۔

ہوسکتا ہے۔ کہ اس لفظ کے دو جزو ہوں۔ ایک پیٹر، دوسرا ولیم۔ پیٹروگراڈ روس کا دارالحکومت ہے۔ دوسرا ولیم قیصر جرمنی کا نام ہے۔ سو ممکن ہے۔ کہ روس کا یہ شہر گم ہوگیا ہو یا

قیصر ہی جاتا رہا ہو۔ اگر پہلی خبر درست ہو۔ تو پٹروگراڈ کے نام سے جو تار خبریں آتی ہیں وہ
سراسر غلط ہیں۔ کیونکہ وہ پردۂ زمین پر آج کل موجود ہی نہیں ہے۔
اور اگر دوسری خبر صحیح مانی جائے تو تسلیم کرنا چاہیئے کہ قیصر ولیم گم ہو گیا یا کم ہو گیا
اور جب قیصر میں کمی ہوئی، تو لا محالہ جنگ بھی کم یا گم ہو گئی ہوگی۔ لہٰذا جو خبریں جرمنی کے
حملوں کی آتی ہیں وہ سراسر جھوٹ اور بے سر و پا ہیں

طائر ہوائی کی بیٹ

مشہور ہے کہ کسی شاعر نے ایک شعر کہا۔ اور اس کی داد آسمان سے مانگی، اوپر سے
کسی چیل نے بیٹ کی۔ جو شاعر کے منہ پر گری اسوقت شاعر نے کہا۔ کہ "سخن فہمی عالم بالا معلوم
شد"
اسی طرح اردو کی مثل ہے۔ کہ آسمان کا تھوکا حلق میں آتا ہے۔ جرمن والے جو اپنے آلات
حرب کے غرور میں آسمان پر اُڑے چلے تھے اب ان پر انگلستان کے طائر ہوائی (جہاز) بیٹ کر رہے
ہیں۔
بیٹ انگریزی میں مارنے کو کہتے ہیں۔ لہٰذا ان ہوائی پرندوں کی آتشی بیٹ جرمن کے
منہ پر ہو رہی ہے۔

جرمن مِس کی کمی!

کہتے ہیں جرمن میں تانبہ تھڑ گیا ہے۔ اس لیئے وہ بلجیم کی رعایا کے برتن لوٹتا پھرتا ہے
فارسی زبان میں تانبہ کو مس کہتے ہیں۔ پس اہل جرمنی کو چاہیئے کہ وہ اپنی مسوں کی مومیائی بنا کر
کیمیائی طریق سے مس بنا لیں۔ کیونکہ چشم بد دور وہ ہنر مندی میں شہرۂ آفاق ہیں غریبوں کے برتن
برباد نہ کریں۔ مسوں کا تانبہ بنانے میں ان کا ایک فائدہ اور بھی ہے۔ کہ نوجوانی کے جنگ میں

مارے جانے سے لاکھوں کنواریاں حسرت کی آہیں کھینچ کھینچ کر گشتہ ہو رہی ہونگی اس کا تدارک
قیصر پر فرض ہے۔ پس اس سے بہتر اور کیا تدارک ہو سکتا ہے۔ مرد تو کام آتے ہی تھے عورتیں
بھی ٹھکلنے لگ جائیں گی۔ اور پروشیا کی خونخوار کانوں کا جن میں سے جنگی بھوت برآمد ہوتے
ہیں یوں خاتمہ ہو جائے گا۔

ہم ھتیار کیا کرینگے

کانگریس کے پردھان نے اپنے بھگوان انگریزوں سے درخواست کی ہے کہ اب ہندوستانیوں
کو ہتیار مل جانے چاہئیں۔ تاکہ وقت بے وقت ملک کے دشمن کا مقابلہ کر سکیں۔
مگر ہم کہتے ہیں۔ کہ ہتیاروں کی کچھہ ضرورت نہیں ہے۔ ہندوستانیوں کے پاس گالی
گوسنوں کی کیا کمی ہے۔ جو یہ ہتیاری چیزیں ہاتھہ میں لیں یہ وقت تو ایک عام جلسہ شکر منعقد کرنے
کا تھا جس میں ایک خاص ریزولیوشن آف تھینکس پاس کیا جاتا۔ کہ سرکار نے بد دعاؤں گالیوں
پر اپنی مہربانی سے لائسنس نہیں لگایا۔
ہم کالوں کی کالی زبان ہے کہ اگر جی لگا کر۔ دانت کچکچا کر کوسنے دیں تو جرمنی کے
بڑے منہ کی توپوں میں کیڑے پڑ جائیں۔
ہتیار ہاتھہ میں آئیں گے تو ملکش مسلمان گالیاں بھول کر خواہ مخواہ جتو ہتیار پر اتر آئینگے

مسجد میں تجانے کا ذکر

علی گڑھ کی اچھوتی علمی کانفرنس کے جلسہ میں صدر انجمن میں اس لن کہنی چیز کا نام بھی
لے دیا جس کو پھٹے دیدے والے جنگ کہتے ہیں۔ اور کہا بھی تو اس طرح کہ اہل مغرب کو لامذہب
بنا دیا۔ مسجد والے مولوی رحیم بخش صاحب کی اس بجی جرات پر جتنی اذانیں دیں تھوڑی ہیں۔

مگر انصاف یہ ہے۔ کہ آیندہ کے لیئے اس مثال سے طرح طرح کے اندیشے ہوتے ہیں علی گڑھ کانفرنس

میں سیاست کا ذکر اذکار کیا کہیں بس ہے شان پروردگار

اس لفظ میں دو پے ہیں۔ اسواسطے یہ انگریزی زبان کے لفظ پاپولر (ہر دل عزیز) کے

زیر اثر آگیا ہے۔ آج کل ریوٹر کی تار خبروں میں بہت مستعمل ہے۔ اور ہر اخبار اپنے کالموں میں

اس کے لیئے جگہ نکالنے پر مجبور ہے۔

ایک چیونٹی کا بیان قرآن شریف میں ہے۔ کہ بادشاہ لوگ چھوٹوں کو بڑا اور بڑوں کو

چھوٹا کر دیتے ہیں۔ پس کتب لغات کے تمام الفاظ اس لفظ کی آسمان نشینی پر جسقدر رشک

کریں۔ کم ہے۔ کہ یہ عزت اس کو لڑائی کے سبب حاصل ہوئی ہے۔

جنرل فان

فان ہنڈن برگ جرمنی کا مشہور سپہ دار ہے۔ اس کو کسی نے مشورہ دیا۔ کہ فلاں فلاں دریا کے کنارے

کنارے جاؤ۔ تو پٹروگراڈ فتح ہو جائے گا۔

جنرل نے ایک تقریر میں کہا۔ کہ اگر روسی اقرار کریں۔ کہ وہ میرے اس سفر میں مزاحمت

نہ کریں گے۔ تو میں اس مشورہ پر عمل کر سکتا ہوں،

پھر اس نے کہا میں خود ہی ان تجاویز پر عمل کر لوں گا۔ کیونکہ میں فنون جنگ سے ناواقف

نہیں ہوں۔

بے شک جنرل فان کو اپنی خودی کے بل پر کام کرنا ہوگا۔ مگر ان کی خودی جس اسم کا

مسمیٰ ہے۔ اس میں فان لگا ہوا ہے۔ جس کے معنی فنا ہونے کے ہیں

معلوم نہیں وہ اس لفظ سے فاعلیت کا اثر حاصل کریں گے یا مفعولیت کا۔

آخری اثر ہوا تو ان کے ہاتھوں سے جرمنی قوم کا فنا ہو جانا لازمی ہے۔

رُومانیہ کی رَے

رومانیہ بھی اپنی حفاظت اور ملکی دور اندیشی کی خاطر شریک جنگ ہونے والا ہے۔ کون جانتا ہے۔ کہ اس رو کی پشت کیا ہوگی

رن کی رے بڑی ہولناک ہے۔ جرمنی کی رے سے پوچھو۔ فرانس کی رے سے دریافت کرو۔ روس کی رے منہ سے بول رہی ہے۔ آسٹریا کی رے فریاد کر رہی ہے۔ برٹش کی رے میدان میں جمی کھڑی ہے۔ ترکی کی رے ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں کہہ کر معرکہ میں کود چکی ہے۔ اس چھٹی رے سے کون کہے کہ اپنے مان کو رہنے دے۔ لڑائی بری چیز ہے۔ گر یہ رے نسائی تو ارتقائی اثر سے ڈر ہے۔ کہ امریکہ کی ساتویں رے میدان میں بے حجاب نہ ہو جائے۔

آپان

جاپانی وہاں کے چاول کھانے والے ہندوستان کے پان کے قریب ہونے کے سبب اپنے ملک کو جاپان کہتے ہیں ان سے کہدو۔ کہ ہمارے پان کو نظر نہ لگائیں۔ کیونکہ ان کی زبان سے جاپان سنکر جی دھڑکتا ہے۔ وہ ہمارے دوست ہیں تو اپنے ملک کا نام آپان رکھلیں تاکہ پان خور ہندوستانی وہاں جا کر علم و ہنر سیکھہ آیا کریں۔ پان پر جا کا لفظ ٹھیک نہیں عرب والے جاپان کو یاپان کہتے ہیں۔ شاید اُنھوں نے اسی ہندوستانی دور اندیشی کو ملحوظ رکھا ہو،

مصر کی مصری

بیمار آدمی کو مٹھاس بہت مضر ہے۔ پھر خبر نہیں ترکی کو کس خطرۂ جاں طبیب نے رائے دی

کہ وہ مصری کہانے گھر سے نکلے،

کمزور معدہ کو مصری اچھی نہیں۔ ایسا نہ ہو سنُنار کا جلاب دینا پڑے۔ کاش کوئی ہمدرد مرد بیمار کو اس حرکت سے روک سکتا۔

آسٹریا کی آس

اسٹریا کے بڑے بادشاہ نے جب اس پر لڑائی چھیڑی، تبھی اس کا بڑا خمیازہ بھگت چکا۔ اب اس کی آس ترکی جنگ سے بندھی ہوئی ہے آخر (بعد) کی خبر خدا جانے۔ مگر اس وقت تو یہ اس کی آس پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔

عبّاس کی باس

عباس حلمی سابق خدیو مصر حملہ آور فوج کے کمانڈر بنے ہیں۔ باس کے معنی عربی میں جنگ کے ہیں۔ اگر ان کو اس جرم نے لڑائی پر آمادہ کیا تھا۔ تو حلمی نے نہ روکا۔ اور بردباری و برداشت کی صلاح نہ دی۔ دیکھئے اس عبدالباس (غلام جنگ) کے معانی کیسے رہتے ہیں۔

خطیب کے ساتھ کنگ جارج

اخبار خطیب کے ہر پرچے کے ساتھ حضور بادشاہ سلامت رہتے ہیں۔ اور ان کی ہمراہی نہ ہو۔ تو کوئی انگریزی ڈاکخانہ اس کو قبول نہ کرے۔

یوں تو ہر اخبار کے ساتھ جہاں پناہ کی شبیہہ سایہ افگن ہے۔ مگر خطیب کے سوا آجتک کسی نے اس کی معیت کو قدردانی کی نگاہ سے محسوس نہیں کیا (دیکھا؟) اس محرم کو،

جنوری میں جانوری

جنوری کی سردی میں ہر انسان جانور بن جاتا ہے۔ اور ہر وقت لحاف و کمبل کے بھٹ میں گھسا رہنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اس ماہ کی رخصت کے وقت یہ اپیل انجمن ترقی اردو کے گوش گذار کرنا برمحل ہوگا۔ کہ وہ اس کی جانوری پر کسی لایق شخص سے کوئی کتاب لکھوا لے۔

بڑے آدمی کی بات

دکن کے سفر میں ایک بڑے آدمی نے مجھ سے کہا۔ کہ میں اپنے لڑکے کو علی گڑھ کالج بھیجنا چاہتا ہوں۔ مگر آج کل دہلی میں جرمن سے لڑائی ہو رہی ہے اسواسطے ارادہ ملتوی کر دیا۔

چونکہ بڑے آدمی کی بات بڑی سمجھی جاتی ہے۔ میں نے بھی اس کو بڑا سمجھا۔ اور کوئی وجہ نہیں۔ کہ اسپر یقین نہ کروں۔ لہٰذا مانتا ہوں۔ کہ ضرور دہلی پر جرمن لڑ رہے ہیں اور جب کہ وہ میرے شہر پر لڑ رہے ہیں۔ تو مجھ پر ان کا مقابلہ فرض ہے۔ لہٰذا میں تمام بڑے آدمیوں کی بڑی باتوں کا ایک لشکر جمع کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ جرمنی کی بڑی توپ جیت سکوں۔

مجھے امید ہے کہ دہلی والوں کی بڑی باتوں کے گولے جرمنی گولوں پر ضرور فتح پائیں گے۔ کیونکہ جرمنی توپ موٹر پر چل سکتی ہے۔ مگر یہاں کی بڑی باتیں اسقدر وزنی ہیں۔ کہ کسی چیز سے نہیں اٹھ سکتیں۔ بس بھاری چیز ہلکی چیز پر قدرتاً فتح پاتی ہے۔

کوہ قاف کی پریاں

پرانے زمانے میں مشہور تھا۔ کہ کوہ قاف میں دیو پری کی آبادی ہے۔ اب خبریں آئی ہیں۔ کہ وہاں ترکوں نے حملہ کیا ہے۔ اور انور بے اس فوج کے کلفام بن کر گئے ہیں۔ دیکھئے قاف کی سبز پری کو روس کا لال دیو آدمزاد کے پہلو میں دیکھ سکے گا یا نہیں۔

آسمان کے راجہ اندر بھی گوارا نہیں کرینگے۔ کہ آدم زاد پریزادونیں ہے۔ اور ترکوں کو مایوسی کے ساتھ واپس آنا پڑے گا۔ مگر نہیں گیا۔ ہم تو ہندوستان کے پرستان میں رات دن سارنگیوں کے آس پاس کی پریاں نچاتے ہیں، یہ ڈراونے کام ان ہی خونیوں کو مبارک جن کا دیدہ پھٹا ہوا ہو

تاب ریز

تبریز تاب ریز کا مخفف ہے۔ جب ایران کے عاشقوں نے بےتابی کی شکایت کی تو یہ شہر تاب و توانائی تقسیم کرنے کھڑا ہوگیا۔ اب یہ خود مدت سے بیتاب تھا سنتے ہیں۔ ترک دلربایانہ انداز سے اس کے گھر میں آیا۔ اور اس کی پشت پر ہاتھ رکھکے مسکرایا۔ خبر نہیں تاب ریز کے دل پر اس کی آمد سے کیا گذری ہوگی۔ تاب آئی ہوگی یا بےتابی بڑھ گئی ہوگی۔ مگر ہمارا جی تو اس ترکی یورش سے بیتاب ہوگیا۔ کیونکہ یہ اپنے ساتھ رقیب جرمن کو بھی لایا ہے۔ کسی اور مستانہ کو لاتا تو مزا آتا۔ قوال گاتا۔ مولوی ہرگز نہ شد مولانا روم، تا غلام شمس تبریزی نہ گشت تو ہم بھی حال لاتے۔ اب شمس تبریزی کی ادائیں نہیں، ابرق برلنی کی شعائیں ہیں۔ ان سے ہمیں کیا واسطہ وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

کیا بحث ہے ایران سے یا ترک و عرب سے	اسوقت تجھے قطع نظر چاہیے سب سے
گر تخت پہ بیٹھے کوئی یا تخت سے اترے	رکھ کام تو دن رات فقط طاعت رب سے (اکبر)

دردمہ

اخبار ہمدرد کو الٹ کر دیکھو تو دردمہ بن جائے، اس واسطے ثابت ہوا۔ کہ ضرور اس کے ایڈیٹر کے شکم میں ہلال کا درد ہے۔

پس کوئی وجہ نہیں کہ مسٹر محمد علی کو تندرست مانا جائے۔ اور ڈاکٹر انصاری کو ان کے اپریشن کی صلاح نہ دی جائے۔ کیونکہ ڈاکٹر موصوف ترکی مشن کے تجربوں کے سبب تمام بلائیں

امراض سے واقف ہونگے،

لال ہلا

الہلال بند ہو گیا، یہ بے نقط اخبار تھا، اور سب کو بے نقط سناتا تھا جب چارہ کار کی تدبیریں ہونے لگیں، تو اس کے حروف کو ہی اُلٹ کر دیکھا۔ تو حکم ملا د لال ہلا معلوم نہیں الہلال کے محرر خصوصی لالوں کا ہلانا منظور کریں گے یا نہیں۔ طوطے تو بہت سے پال چکے ہیں۔ لالوں کا پنجرا بھی رکھ لیں تو کیا مضائقہ ہے۔

راؤ اور وار

اگر راؤ بہادر لوگ وار میں بہادری کے جوہر دکھائیں تو آیندہ ان کو وار بہادر کا خطاب ملنا چاہیئے، اور لازم ہے۔ کہ وہ لڑائی میں ضرور جائیں۔ کیونکہ وار ان کے نام میں مخفی ہے۔

ریش پنجاب

لاہور میں سکھوں کا شیر پنجاب نامی اخبار نکلتا ہے، اور سکھ ڈاڑھی کی حفاظت میں شہرۂ آفاق ہیں۔ اسواسطے یہ اخبار در حقیقت ریش پنجاب ہے۔

اس کے علاوہ شیر کا لفظ اندنوں کچھ مناسب بھی نہیں۔ ریش میں یہ فائدہ ہے کہ بازی کیوقت با باکی ریش ہے اگر بازی ہونے لگے۔ تو بازی گردوں کو سب یہ کہہ کر دھمکا دینگے، کہ جا! بازی بازی باریش با با ہم بازی؟

بطیخ اخبار

بطیخ عربی میں تربوز کو کہتے ہیں۔ بس اخبار خطیب اصل میں تربوز اخبار ہے،

جو دیکھنے میں خون آشام مگر باطن میں شیریں اور جی کو ٹھنڈا کرنے والا ہے۔

گلاب پریس

دردیش پریس ایک قسم کا گلاب پریس ہے کیونکہ بیش کا عکس شی اور درو کا اُلٹا وُرد جس کے معنی گلاب کے ہیں۔ گویا ایک قسم کا گلاب۔

خونی تجارت کے نمونے

یورپ نیچر پرست ہے، اور اس لئے نیچر بھی اس کی نازبرداریوں کا بہت خیال رکھتی ہے اس نے دیکھا، کہ میرے پرستار کا تجارتی لین دین ہندوستانی سے بھی تھا۔ اور تجارتی مال کے نمونے یہاں آیا کرتے تھے۔ اس واسطے اس نے یورپ کے خونی بکار کے نمونے یہاں بھی بھیجنے شروع کئے ہیں۔

پہلا نمونہ خوراک کی تنگی ہے۔ جو ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل چکی ہے۔

دوسرا بم بازی ہے جو پنجاب میں شروع ہوئی ہے۔ تیسرا نمونہ بارش اور ٹھنڈی ہوا ہے۔ یا تو مینہ برستا ہی نہ تھا۔ اور برسا تو ایسا۔ کہ غریب ہندوستانی ٹھٹھر کے رہ گئے۔

گویا نیچر دکھاتی ہے کہ میدان جنگ میں اس قسم کی سردی ہو گی۔ ہم کو یہ نمونے دیکھ کر نیچر سے کہدینا چاہئے۔ کہ بالفعل اس میں سے کوئی نمونہ پسند نہیں۔ لہٰذا فرمایش نہیں دی جا سکتی

بمب

خواجہ میر درد نے فرمایا تھا۔ درد جس پہلو سے اٹھو درد ہے۔ اب درد و نیاز کا وقت نہیں ہے قسمت نے بمب کا دور دکھایا ہے۔ یہ بھی اس مصرعہ کا شریک معلوم ہوتا ہے۔ اور کہہ سکتے ہیں۔ کہ بمب جس پہلو سے اٹھو بمب ہے"

زوجہ الاؤنس

خان بابا مسٹر محمد علی نے اعتراض کیا ہے۔ کہ مسٹر ٹول پرنسپل علی گڑھ کالج کی تنخواہ میں سو روپیہ کا اضافہ کیوں کیا گیا۔ کالج کے ٹرسٹیوں کا کہنا ہے۔ کہ یہ مسٹر ٹول کی بیوی کا اور بیٹی کا الاؤنس ہے، چونکہ اس قحط سالی کے زمانہ میں مسٹر ٹول بیوی کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے تھے اس لیئے ٹرسٹیوں نے زوجہ الاؤنس منظور کر لیا۔ مگر ٹرسٹیوں کا بیان ہے، کہ یہ اضافہ عارضی ہے، دور پار دشمنان یہ بڑا بدشگونی کا بیان ہے۔ ہم تو دعا کرتے ہیں، کہ مسٹر ٹول اپنی اہلیہ کے ساتھ ہمیشہ شاد آباد رہیں۔

دیکھنا یہ ہے کہ مسٹر محمد علی ہندوستانیوں کے لیے بھی قحط الاؤنس سرکار سے طلب کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر کالے نوکروں کے لیے مانگتے ہو۔ تو گورے نوکروں کو پہلے دینا بھی چاہیئے

التحیات کی انگلی

مصر سے خبر آئی ہے۔ کہ وہاں جمعہ کے خطبوں سے خلیفہ اسلام کا نام نکالدیا گیا ہے۔ صرف خلیفہ کا لفظ کہا ہے۔ اسپر اخبار ہمدرد کو تعجب ہے۔ کہ لفظی خلیفہ سے کون شخص سمجھا جائے گا اسواسطے اس نے صلاح دی ہے۔ کہ ہمدرد میں ایک اشتہار دیا جائے۔ کہ "ضرورت ہے خلیفہ کی" درخواستیں خوشخط آنی چاہئیں، اُمیدواروں کو تھوڑی سی عربی جاننی لازمی ہے

ہماری رائے میں یہ ہونا چاہیئے۔ کہ جسطرح التحیات میں تشہد کے وقت انگلی کا اشارہ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح خطیب خلیفہ کا نام لیتے وقت انگلی کو گردش دیدیا کرے، ترکی کے دوست اس اشارے کو سلطان کی جانب سمجھ لیں گے، اور باقی لوگ اپنے اپنے مفہوم پر منطبق کر لیں گے اس سے بھی زیادہ مناسب یہ تجویز ہے کہ خلیفہ محمد حسین صاحب وزیر پٹیالہ کے خاندان سے اس میں استورہ کیا جائے، کیونکہ ان کے ہاں خلیفہ نام کے ساتھ شریک ہے،

خفیف عدالت کا جج

میں نے اکی میز پر کاغذوں کا انبار دیکھا تو خیال ہوا۔ کہ کوئی بڑے سیاح ہیں سفرنامہ کے اوراق دیکھ رہے ہیں، یا فطرۃ وسائنس کے محقق ہیں علمی کارناموں کا ذخیرہ سامنے ہے مگر سوال کرنے پر انہوں نے نہایت خفیف ہوکر کہا۔ فدوی خفیف عدالت کا جج ہے ساری زندگی دس پانچ روپے کے جھگڑوں میں گذری چلی جاتی ہے۔ جب لوگ کہتے ہیں جج صاحب تشریف لائے ہیں، تو دل میں اندر ہی اندر خفیف ہوتا ہے

حقیقت یہ ہے۔ کہ آپ نے جوان کاغذات پر سفرنامہ یا تحقیقات فطرت وسائنس کا شبہ کیا اس سے مجھے بڑی غیرت آئی۔ کاش میں ایک سیاح اور فلاسفر ہوتا۔ اور خفیف عدالت کا جج نہ ہوتا۔

سارنگی اور پیانو

سارنگی بج چکی اب پیانو کا دور تھا۔ وہ بھی چپ ہوتا چلا ہے۔ کسی نے سارنگی سے پوچھا تم مدت سے ہماری بزم میں نہیں آئیں۔ اس نے کہا آؤں کیا خاک جن سے بزم میں زینت ہی وہ آگے کھڑی ہوتی ہیں، اور میں سازندہ کے پاس بیٹھی پیچھے بلبلایا کرتی ہوں، پیانو کی قسمت دیکھو خودمس صاحب اپنی انگلیوں سے اُسے نوازتی ہیں۔ اگر بی گوہر خود سارنگی بجائیں۔ تو میری ہستی سلامت رہ سکتی ہے۔ ورنہ ایک دن ہند میں پیانو کے سوا میری شکل کہیں بھی نظر نہ آئے گی۔ گوہر ولایت ہوکر آئی ہیں۔ انہوں نے وہاں سیکھا ہوگا۔ کہ اپنے ملک کی ہر چیز کو دوسروں پر فوقیت دی جاتی ہے۔ خبر نہیں گوہر جان نے سارنگی اور پیانو کی نسبت کیا فیصلہ کیا۔ کہ ان میں سے کون بہتر ہے۔ اگر وہ ہندوستان کی سپوت لڑکی ہیں۔ (کیونکہ مجھے گوہر جان کے باپ کا نام معلوم نہیں) تو ان کو لازم ہے۔ کہ سارنگی خود بجایا کریں ورنہ یورپ والے کہیں گے۔ کہ ہندوستانی

اپنا کام دوسروں کے سپرد کر دیتے ہیں، اسی لیئے تو ذلیل رہتے ہیں،

موتی محل دنیا میں

ان کو بہشت کے قصر گوہر کا یقین نہ تھا اس لیئے انہوں نے گوہر جان کے وجود کو موتی محل تصور کیا۔ اور اس کے ناچ میں اپنی موتی کی سی آبرو برباد کی وہ کہتے تھے، گوہر بھی بحرین کا ایک پرانا موتی ہے۔ موتیوں کا دوالہ اسی قسم کے گوہر پرستوں کا نکلا تھا۔ مگر ان لوگوں کی آنکھوں میں شیطان موتیا بند ہو کر بیٹھ گیا ہے، مریں گے تو قدر معلوم ہوگی۔ اور آنکھ کھلے گی،

پیش آور

آمد اور آورد کے فرق کو شاعر خوب جانتے ہیں، آمد کو آورد پر بڑی فوقیت ہے۔ لیکن سنا ہے کہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ کہ شاعر آورد کرتا ہے، اور ہوتے ہوتے آمد ہونے لگتی ہے۔

شہر پشاور کی اصل بھی پیش آور ہے۔ اور کسی زمانے میں ہندوستان کے ہر فاتح کو پہلے یہی شہر پیش آتا تھا۔ گویا پشاور آمد اجنبی کا دروازہ آورد تھا۔

خیر ہم شاعر نہ فاتح۔ آورد اور آمد دونوں سے سروکار نہیں۔ پیش آور ہو۔ یا پیش آمد ہمیں کیا۔ ہمیں تو اپنی پیش آنی (پیشانی) کے لکھے پر زندگی گذارنی ہے۔

جارجانہ حملے

جن لوگوں کو عربی کے موٹے موٹے الفاظ کی سمجھ نہیں ہے وہ آج کل اخباروں میں جارحانہ حملوں کو جارجانہ حملے پڑھتے ہیں، اور جانتے ہیں، کہ جس حملہ میں خود سبقت کی جائے وہ ہمارے جارج بادشاہ سے منسوب ہے۔ اور یہ جارجانہ لفظ شاہ جارج سے ہی تعلق رکھنے والا بول ہے۔

ناروے

اس لفظ کے دو حصے ہیں۔ پہلا نار عربی بمعنی آگ۔ دوسرا وے انگریزی بمعنے راستہ
یا نار صے باب النار ہے۔ اب تک تو وہ لڑائی کی آگ سے الگ تھا۔ مگر عجب نہیں۔ کہ اپنے
م کی نحوست کے سبب اس کو بھی جہنم رسید ہونا پڑے،

روٹی کا فوٹو

رسالی کے زمانہ میں اگر روٹیوں کے فوٹو غربا میں تقسیم ہوجائیں۔ تو یقین ہے بھوکوں کو بازار
نے اور غل وشور کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ کیونکہ ہندوستان صورت پرست ہے۔ روٹی
دیکھ کر پیٹ بھرے گا۔ کل ہوٹل کی مینیجر صاحبہ نے بھی یہی کہا تھا۔ کہ خود تو کیک کھا
بہ کو اس کا فوٹو دیا۔ میں خوشی خوشی اس کو اپنے گھر لایا۔ اور بازار سے ایک پیسہ کی ریوڑیاں
میں اور کیک کے فوٹو کو دیکھتا جاتا تھا۔ اور ریوڑیاں کھاتا جاتا تھا۔

بس اگر روٹیوں اور مٹن چاپ کے فوٹو تقسیم ہوجائیں تو غریب لوگ چنے چبائیں گے
رے مرغی کے انڈے اور مٹن چاپ کے لیں گے،

خوپوشی سے روپوشی

خبر آئی ہے۔ کہ لاہور کے انگریزی پڑھنے والے طالب علم کہیں روپوش ہوکر غائب ہوگئے
ی تعلیم کی نسبت پرانے لوگوں کا عقیدہ تھا۔ کہ وہ ایمان پوش ہے اور خوپوش ہے
انگریزی پڑھ کر انسان کا ایمان اور عادت بدل جاتی ہے۔ اب اس خبر سے معلوم ہوتا ہے

کہ وہ روپوشی بھی سکھاتی ہے۔

کوئی ان جوانمردوں سے پوچھے کہ عورتوں کو پردہ سے نکالتے نکالتے خود پردہ نشین کیوں ہوگئے۔ مرد تو مردِ میدان بنکر کام کرتے ہیں۔

دہلی میں میکائیل

بنگال کے لاٹ صاحب جن کا نام نامی میکائیل ہے، دہلی تشریف لائے ہیں، ہم لوگوں کا عقیدہ ہے کہ میکائیل بارش کا فرشتہ ہے یہ فرشتہ آجائے۔ تو عزرائیل کا کہاں ٹھکانا ہوگا جو قحط کے سبب آج کل ہر گھر میں مسلط ہے مگر مشکل تو یہ ہے جہاں ایک مہمان پہلے سے موجود ہو، دوسرے کی خاطر دشوار ہوتی ہے۔ اس موقعہ پر حاجی اسمٰعیل خان (اسمعیل) کو آگرہ سے بلاکر مشورہ کرنا چاہیے۔

طواف اور طوائف

مسلمانوں کو فکر ہے کہ حرمین مقدسہ حریفوں کی دستبرد سے محفوظ رہیں۔ کیونکہ کعبہ کی طواف کی چاہت پر ان کے خون کی گردش منحصر ہے۔

ہندوستان کے رنگیلے جوان کہتے ہیں، طواف رہے یا نہ رہے طوائف کو سلامت رہنا چاہیئے، کہ ہر آرزوئے زیست کا مرکز ہے۔

لیلیٰ کی ضبطی

دلی میں ایک مفسدانہ اشتہار انا لیلیٰ کے عنوان سے شایع ہوا تھا جس کو سرکار نے

ضبط کر لیا۔ لکھنے والے کو یہ خیال ہوا۔ کہ اس قسم کا اشتہار ضبطی سے محفوظ نہ رہے گا۔ پھر اس کا

نام لیلیٰ کیوں رکھا۔ غریب لیلیٰ بھی ضبط ہو گئی۔ تو مجنوں کا کہاں ٹھکانا رہے گا

کل کسی نے مجنوں سے پوچھا۔ کہ اس جنگ میں فتح کس کی ہو گی۔ اس نے کہا جدھر لیلیٰ

ہو گی۔ ادھر ہی فتح ہو گی۔ اب کون اسے خبر دے گا۔ کہ تمہاری انا پکارنے والی لیلیٰ تو خود اسیر

ضبط ہو گئیں

گورنمنٹ رسیدہ

خدا رسیدہ لوگوں کا زمانہ تو گیا۔ گورنمنٹ رسیدہ اصحاب میں مسٹر گوکھلے بھی خوب

آدمی تھے۔ موت نے ان کو کفن کے لفافہ میں بند کر کے شمشان ہومی میں بھیجدیا۔ اور یہ پتہ درج

تھا۔

اللھم بلغہ بالخیر۔ لف ہذا خاص بمقام موضع عدم پور۔ ڈاکخانہ نابود آباد ضلع نیستی تحصیل

فنا گنج رسیدہ بعالی خدمت کارکنان علیین و سجیین ادام اللہ مقاماتھم برسد

اگر مکتوب الیہ بمقام علیین باشد آنجا رسد و اگر بمقام سجین باشد آنجا رسد

مرا معلوم نیست۔ کہ من ملک الموت باشندہ ملک ہندوستانی ہستم۔

چکی کا گیت

چکی کے پاٹوں میں گیہوں پس رہے تھے۔ آٹا بن رہے تھے۔ مگر چکی کا گانا سننے سے باز نہ

آتے تھے۔ چکی گانا گاتی تھی۔ کہ میں بھوکی رہتی ہوں مگر دوسروں کے پیٹ کی خاطر قتل عام کرتی ہوں۔ گیہوں حال میں

آکر جواب دیتے تھے۔ لال سے سفید بنتے ہیں یہ قتل ہے۔ یا مہربانی آجکل تو ہر کالا اور گندمی آدمی گورا

بنتا چاہتا ہے۔ ہم بھی تیری عنایت سے سفید منہ ہو جائیں گے۔ تو ساری عمر احسان مانیں گے

مارچ کا مورچہ

مارچ کی تلوار کو مورچہ نے کھالیا۔ اب یہ مہینہ دنیا سے مارچ (کوچ) کرکے جانیوالا ہے، اس ماہ کے شروع ہوتے ہی جنگ کے مورچہ ہر جگہ بڑھنے لگے، اور لشکروں نے ایک دوسرے پر مارچ کرنا شروع کردیا۔ اب یہ دن خدا کے ہاں جاتے ہیں جس کسیکو کچھ پیام بھیجنا ہو۔ یا کوئی خط دینا ہو۔ اس کو دیدے، خدا کے حضور میں پیش کردے گا ہم نے بھی اس کے ذریعہ پیام بھیجا ہے۔

بخدمت حضرت دقائق، ٹائم سکرٹری حضور پروردگار عالم

سر، مہربانی فرماکر حضور عالم پناہ جل شانہ کی بارگاہ میں عرض کیجیے کہ سورج ابتک مشرق سے نکل رہا ہے۔ ہدایت فرمائی جائے۔ کہ حسب وعدہ اب وہ مغرب سے طلوع ہو

راقم یور ٹیبٹ قلی حسن نظامی

اپریل

دو دن کے بعد ماہ اپریل کا دورہ شروع ہوگا۔ یعنی وقت کی ریل ڈوُں سے اُپ ہوگی یا یوں کہیئے کہ نیچے سے اوپر جائے گی۔ ریل جب کبھی کسی پہاڑ پر چڑھتی ہے تو مسافروں کو بڑے سناٹے آتے ہیں۔ اور وہ کہتے رہیں، کہ خدا خیر کرے۔ اب جب زمانہ اور وقت کی یہ ریل ڈاؤن سے اپ ہوتی ہے۔ تو ہم جیسے کمزوروں کا کلیجہ بانسوں اچھلتا ہے۔

سنتے ہیں پہاڑوں کے باشندے اُپ ڈاؤن ہونے میں بڑے ماہر ہیں۔ یعنی پہاڑوں پر بے تکان چڑھتے اُترتے ہیں۔ لہٰذا ان کو وقت کی ریل میں بٹھادیا جائے۔ اور ہم کو اس سفر سے معافی ملے تو اچھا ہے۔ ہمارا جی تو اس ریل پیل سے گھبرا گیا ہے۔

مہمندی

ہمپل نمبر ٹو ۔ نمونہ ثانی ۔ تو ام کوہستانی کا ہے ، مہم ان میں بند ہے ۔ اور یہ مہم میں بند ، عرف عام میں مہمندی مشہور ہیں ۔ مگر بند ش مادے بے شعور ہیں ،

آفریدی

حیوان ہیں ۔ ناطق ہیں ۔ متحرک ہیں ۔ جامد ہیں ۔ کھجور ہیں قدو قامت میں ۔ کیکر ہیں خاروں سے لبریز ہیں ۔ ترش آم ہیں ۔ سخت اخروٹ ہیں ۔ لوہے کے انجن ہیں ۔ بجلی کے تار ہیں ۔ پلیگ کا بخار ہیں ۔ دغا و دغا ان کی بولی ہیں ۔ داغ دلاغ ان کی جھولی میں

وزیری

نہ بادشاہ کو مانیں نہ وزیر کو ۔ مگر وزیری کہلاتے ہیں ۔ ہمیشہ امن کے طوطے اڑاتے ہیں ۔ شمع زر کے پروانے ہیں ۔ بزم حرب کے مستانے ہیں ،

درِ دانیال

دانیال ایک پیغمبر کا نام تھا ۔ توریت میں ان کے خوابوں کی دھوم ہے ۔ درِ دانیال قسطنطنیہ کی ڈیوڑہی ہے ۔ مگر پرانے گڑ کی ریوڑی ہے ۔ سمندروں کی رال اس کے دامنوں میں بہتی ہے ۔ آج کل یہاں ترکوں اور اتحادیوں کا لام ہے ، اور روس کے دانے گذرنے پر یہ طول کلام ہے ۔ قسطنطنیہ کے دربان اس ڈیوڑہی پر لڑ رہے ہیں ۔ دیکھئے کیا انجام ہوا

قانون کا نون

قرآن شریف کی سورتوں میں سورہ نون میں خدا نے قلم اور اس کے نوشتوں کی قسم کھائی ہے۔ اور برطانی سرکار کے جدید قانون تحفظ متعلقات قلم نے قلم اور ہر ایک چیز پر جو قیامت خیز ال جیل کے ہم معنی ہو نگہداشت کی مہر لگائی ہے۔ نون قاف کی لڑائی ہے۔ مگر کم بختی میرے ناخن کی آئی ہے جو محبت کی سرشاری میں پہلوئے یار کو ہر وقت چٹکی سے گدگدایا کرتا ہے

بیس ہزار باتیں

سرکار نے ظفر علی خان کی ضمانت کے لیے بیس ہزار روپیہ مانگا ہے۔ مگر یہاں روپیہ کہاں۔ تارک دنیا قوم کے پاس اور یہ وسواس رشل ہے، اکہ چیل کا گھونسلا اور ماس ہاں نئے سکے کی بیس ہزار باتیں یہاں موجود ہیں۔ ایک کہتا ہے۔ کہ ظفر علی اسی قابل تھا بڑا شریر ہے۔ بڑا مفتری ہے۔ دوسرا کہتا ہے۔ جان قربان۔ مان قربان۔ باپ قربان، تیسرا کہتا ہے۔ زرمے طلبی سخن درین است،

جھینگر کا جنازہ

میری سب کتابوں کو چاٹ گیا۔ بڑا موذی تھا۔ خدا نے پردہ ڈھک لیا۔ اُفوہ جب اس کی لمبی لمبی دو مونچھوں کا خیال کرتا ہوں۔ جو وہ مجھ کو دکھا کر ہلایا کرتا تھا تو آج اس کی لاش دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ بھلا دیکھو تو قیصر ولیم کی برابری کرتا تھا اس جھینگر کی داستان ہرگز نہ کہتا۔ اگر دل سے عہد نہ کیا ہوتا۔ کہ دنیا میں جتنے حقیر و ذلیل مشہور ہیں۔ میں ان کو چار چاند لگا کر چمکاؤں گا۔

ایک دن اس مرحوم کو میں نے دیکھا۔ کہ حضرت ابن عربی کی فتوحات مکیہ کی ایک جلد میں

چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا کیوں بے شریر تو یہاں کیوں آیا۔ اچھل کر بولا ذرا اس کا مطالعہ کرتا تھا۔ سبحان اللہ بھائی کیا خاک مطالعہ کرتے تھے، بھائی یہ سہم انسانوں کا حصہ ہے، بولا دہ قرآن نے گدہے کی مثال دی ہے۔ کہ لوگ کتابیں پڑھ لیتے ہیں۔ مگر نہ ان کو سمجھتے ہیں نہ ان پر عمل کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ بوجھ اٹھانے والے گدہے ہیں جن پر علم و فضل کی کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہے۔

مگر میں نے اس مثال کی تقلید نہیں کی۔ خدا مثال دینی جانتا ہے۔ تو بندہ بھی اس کی دی ہوئی طاقت سے ایک نئی مثال پیدا کر سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان مثل ایک جھینگر کے ہے، جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں۔ سمجھتے بوجھتے خاک نہیں۔

یہ جتنی یونیورسٹیاں ہیں سب میں یہی ہوتا ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جس نے علم کو علم سمجھ کر پڑھا ہو۔

جھینگر کی یہ بات سنکر مجھ کو غصہ آیا۔ اور میں نے زور سے کتاب پر ہاتھ مارا، جھینگر پھدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا۔ اور قہقہہ مار کر ہنسنے لگا، واہ خفا ہو گئے بگڑ گئے لاجواب ہو کر لوگ ایسا ہی کیا کرتے ہیں،

لیاقت تو یہ تھی، کہ کچھ جواب دیتے، لگے ناراض ہونے اور دھتکارنے،

ہائے کل تو یہ تماشا دیکھا تھا آج غسل خانہ میں وضو کرنے گیا۔ تو دیکھا بے چارے جھینگر کی لاش کالی چیونٹیوں کے ہاتھوں پر رکھی ہے۔ اور وہ اس کو دیوار پر کھینچے لئے چلی جاتی ہیں۔

جمعہ کا وقت قریب تھا، خطبہ کی اذان پکار رہی تھی۔ دل نے کہا جمعہ تو ہزاروں آئیں گے خدا سلامتی دے، نماز پھر پڑھ لینا۔ اس جھینگر کے جنازے کو کندھا دینا ضروری ہے یہ موقع بار بار نہیں آئے گا

بچارا غریب تھا، خلوت نشین تھا خلقت میں حقیر و ذلیل تھا۔ مگر وہ تھا خلیفہ سمجھا جاتا تھا۔ اسی کا ساتھ دیا۔ تو کیا امریکہ کے کروڑپتی راک فیلر کے شریک ماتم ہو گے۔

اگرچہ اس جھینگر نے ستایا تھا جی دکھایا تھا۔ لیکن حدیث میں آیا ہے۔ کہ مرنے کے بعد

لوگوں کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا کرو۔ اس واسطے میں کہتا ہوں۔

خدا بخشے بہت سی خوبیوں کا جانور تھا۔ ہمیشہ دنیا کے جھگڑوں سے الگ کونے میں کسی سوراخ میں بوریئے کے نیچے آبخورہ کے اندر چھپا بیٹھا رہتا تھا۔

نہ بچھو کا سا زہریلا ڈنک تھا۔ نہ سانپ کا سا ڈسنے والا پھن۔ نہ کوّے کی سی شریر چونچ تھی۔ نہ بلبل کی مانند پھول کی عشقبازی۔ شام کے وقت عبادت رب کے لیے ایک مسلسل بین بجاتا تھا۔ اور کہتا تھا۔ کہ یہ غافلوں کے لیے صور ہے اور عاقلوں کے لیے جلوہ طور،

ہائے رے غریب مر گیا۔ جی سے گذر گیا۔ اب کون جھینگر کہلائے گا۔ اب ایسا موچھوں والا کہاں دیکھنے میں آئے گا۔ ولیم میدان جنگ میں ہے ورنہ اسی کو دو گھڑی پاس بٹھا کر جی بہلاتے کہ مری سٹی کی نشانی ایک یہی بے چارہ دنیا میں باقی رہ گیا ہے۔ ... ...

... ...

ہاں تو "جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے" چیونٹیاں تو اس کو اپنے پیٹ کی قبر میں دفن کر دینگی۔ میرا خیال تھا۔ کہ ان شکم پرستوں سے اس توکل شعار فاقہ مست کو بچا تا ویسٹ منسٹر ایبے یا قادیان کے بہشتی مقبرہ میں دفن کراتا۔ مگر جناب یہ کالی چیونٹیاں بھی افریقہ کے مردم خوار سیاہ وحشیوں سے کم نہیں۔ کالی جو چیز بھی ہو۔ ایک بلائے بے درماں ہے۔ اس سے چھٹکارہ کہاں ہے

خیر تو مرثیے کے دو لفظ کہہ کر مرحوم سے رخصت ہوں

جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے   قیصر کا پیارا ہے اسے توپ پہ کھینچو

اے پر وفیسر اے فنا فی سفر۔ اے متوکل درویش۔ اے نغمہ ربانی گانے والے قوال ہم تیرے غم میں نڈھال ہیں اور توپ کی گاڑی پر تیری لاش اٹھانے کا اور اپنے بازو پر کالا نشان باندھنے کا ریزولیوشن پاس کرتے ہیں۔ خیر اب تو تو شکم مور کی قبر میں دفن ہو جا۔ مگر ہم ہمیشہ ریزولیوشنوں میں تجھے یاد کرینگے۔

بنت چھپکلی

خدا کے لیے ریڈیو جلدی آؤ۔ اس بنت چھپکلی کو دیوار پر سے ہٹاؤ، اکیلی پروانوں کو کھائی جاتی ہے۔

گرمی آئی میں نے لیمپ جلایا۔ پروانوں کی آمد ہوئی لکھتا پڑھتا خاک نہیں ان کی بیقراریاں دیکھ کر جی بہلاتا ہوں۔ یہ شہر یہ چھپکلی زادی کہاں سے آ گئی جو غریب عشق بازوں کو نگل رہی ہے۔

ابھی تو بس ہے۔ لیڈی ہوگی تو خبر نہیں کیا غضب ڈھائیگی۔ اس کی دم کاٹ لو۔ بڑی اتراتی ہے۔ کیوں ری مردار میرے چاہیتے پتنگوں کو کیوں کھاتی ہے۔ جلا دوں تیرا منہ بھڑکاؤں شعلہ۔ بجھاؤں تیری زندگی۔

ہائے ریڈیو، تم اب تک نہ آئے دیکھو اس نے پھر ایک تیتری کو پکڑ لیا۔ منہ میں دبائے ہوئے ہے۔ گردن اونچی کرتی ہے۔ اور نگلنا چاہتی ہے۔ بچاری تیتری کیسی بیکسی سے اس کے منہ میں تڑپتی ہے۔

بھائی یہ عشق بڑی بلا ہے۔ نہ روشنی آئی۔ نہ جان گنوائی۔ شعلہ پر پہنچی تھی۔ محبوب کے رخ تک رسائی نہ ملی، تو چھپکلی کی آتش شکم کی نذر ہوئی۔

اللہ ایک زمانہ تھا۔ جب آبادیہ کا شانہ تھا۔ ہر چیز صاف تھی۔ نہ مچھر آتے تھے نہ کھٹملوں سے ہی نجات تھی چھپکلیوں کا بھی گذر نہ ہو سکتا تھا۔ مگر جب سے ویرانہ میں گھر بنا ہے سب آتے ہیں۔ طرح طرح سے چٹکیاں لے کر رلاتے ہیں

تم کہتے ہو ہم اکے پرچے کو چٹکیاں لکھ کر دوں، کیا لکھوں میرے دل میں خود لوگ چٹکیاں لے رہے ہیں۔ اور تم خیال نہیں کرتے۔

خبر نہیں خدا نے مجھے حس کیوں دی ہے۔ اس کے ہاتھوں جی نڈھال ہے۔ ہر صبح و شام

جان کو نیا وبال ہے۔ مجھ کو سوخت ہوتی ہے آپ کباب کا مزا اٹھاتے ہیں۔ اچھی تعریف ہے۔ اچھی واہ واہ ہے۔

فطرت شناسی کیسی مجھے خدا کے یہ جانور چین نہیں لینے دیتے کہاں جاؤں اور کیونکر دل سے ان باتوں کو جدا کروں۔ جب طبیعت میں موج آئے گی لکھ دونگا۔ اب کے تو اس خط کو چٹکیوں میں اوریح کر دینا۔

حکمران

مائی ڈیر سٹہ [سولہ ۱۶]

ویل کم، ہلو ہلو۔ مائی ڈیر سٹہ[۱۶] اندر آیئے، کیک چکھیے۔ کم سہاس کی چا پیجیے، انگیٹھی گرم ہے ہاتھ سینکیے۔ ناک کو تو سردی نہیں لگتی خنکی معلوم ہو۔ تو اس کو بھی گرما لیجیے، گر ہاں آپ کے ناک ہے بھی نہیں سٹہ[۱۵] کے تو نہ تھی۔ اہل جرمنی نے وعدہ خلافیاں عہد شکنیاں کر کرکے بچارے کی ناک کاٹ لی تھی۔

بھائی میرے گھر میں بریک فاسٹ کا تو کچھ سامان نہیں ہے۔ تیرہ تیزی کی گھونگنیاں کھا کھا کر دن کاٹتا ہوں۔ تمہارے لئے ایک خانساماں سے کیک کا ایک ٹکڑا اور ٹھنڈی بھیکی چار کی پیالی مانگ لایا تھا۔ "چہ کند بے نوا ہمیں دارد" صبر کر کے اسی کو نوش کرلو۔ زیادہ حرص ہو۔ تو میدان جنگ میں جاؤ۔ وہاں سب کچھ ملے گا۔

ذرا سنو خدا نے کہا تھا میں خود زمانہ اور وقت ہوں۔ کیا تم بھی خدا ہو۔ کیونکہ تم بھی زمانہ اور وقت ہو، مگر خدا تو بدلا نہیں کرتا۔ اور تم بارہ مہینے میں بدل جاتے ہو۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ تم خدا نہیں ہو۔ پس جب تم خدا نہیں ہو، تو لاؤ میرا کیک پھیر دو۔ اور چار کی پیالی بھی واپس دو۔

ہاں یاد آیا میں تو مشرقی ہوں۔ اور مشرق والے دیکر واپس نہیں لیا کرتے۔ اچھا خیر کھا لو نگل لو

تھوڑا تو، تمہیں کس نے بلایا تھا۔ ہاں نہ ماں میں تیرا مہمان آؤ بھگت کرتا۔ تو اپنے محرم کی کرتا جو میرا لاڈلا ہے۔ ہجری سنہ کا پہلا پیغام لے کر آتا ہے۔ تم سے مجھے کیا غرض تم کو پادری صاحب کے ہاں جانا چاہیے تھا

لاحول ولاقوۃ، معاف کیجیے گا، جناب بھوک و مفلسی میں انسان کی عقل قابو میں نہیں رہتی۔ آپ ہمارے بادشاہ کی نشانی ہیں۔ ہر دفتر میں آپ ہی کا سکہ چلتا ہے۔ ہماری قوم تو آپ سے اس قدر محبت رکھتی ہے، کہ ہر شخص دیوار پر آنکھوں کے سامنے آپ ہی کو لٹکاتا ہے۔

جنوری کی قسم میں تمہارا تابعدار ہوں، وفا شعار خادم ہوں، تمہارا کیا کہنا، بڑے اچھے ہو، کیسے گرم گرم کوٹ لاتے ہو۔ تمہارے آنے کی خبر سنکر ایک مہینہ پہلے خیرات بانٹنے والے مجھ کو لحاف بنوا دیتے ہیں۔ اور لحاف کے اندر مجھ کو ایسا آرام ملتا ہے، جیسا کچھوہ اپنے خول میں۔

میری عادت خوشامد کرنے کی نہیں ہے۔ پر آج تو میں تمہاری خوشامد کروں گا۔ اور کہو تو تمہارے بوٹ بھی صاف کرنے میں عذر نہ ہوگا۔ لیکن یہ وعدہ کر لو کہ تم ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۶ء کی خوں ریزی کو بند کرا دوگے۔

میاں مجھے اس لڑائی سے تو کچھ تکلیف نہیں، دنیا میں کچھ ہی ہوا کرے، مجھے اس سے کیا غرض۔ البتہ یہ بے آرامی ہے۔ کہ سوئیاں اور رنگ بہت مہنگا ہو گیا ہے۔ جانتے ہو، کہ میں دمڑی دھیلہ کا آدمی ہوں، سوئیاں سستی تھیں تو اپنی گدڑی میں آسانی سے پیوند لگا لیتا تھا، اور اوہی کا رنگ لا کر اس کو رنگ لیتا تھا، اب یہ دونوں اس قدر گراں ہیں، کہ میں نہ سوئیاں خرید سکتا ہوں نہ رنگ، یونہی میلا کچیلا چیتھڑے لگائے پھرتا ہوں،

اگر تم لڑائی بند نہ کراؤ۔ تو یہ دونوں چیزیں تو سستی کرا دو۔ بس میں تو فقط اتنا چاہتا ہوں مجھے نہ خطاب چاہیے، نہ کونسل کی ممبری، میں تو روکھی روٹی پیٹ بھر کر۔ اور کنوئیں کا پانی، اور تن کا موٹا جھوٹا کپڑا، چاہتا ہوں۔

کنوئیں کا پانی اس واسطے درکار ہے۔ کہ نل کا پانی لوہے کے منہ سے آتا ہے۔ اور لوہا آج کل توپ میں، بندوق میں، گولے میں، گولیوں میں، آدمی کا خون بہاتا ہے۔ اور میں خون خرابے میں بہت ڈرتا ہوں۔ اندیشہ ہے کہ لوہے کا پانی پی کر کہیں مجھ میں فتنہ و فساد کا اثر نہ آ جائے۔

وہ پلک یا نیمچہ؟
نین کٹاری

یہ پیچ کیوں ماری، کیا زخم تھا کاری۔ دل کو دیکھو، جگر کو ٹٹولو۔ کہیں نہ کہیں چرکہ ضرور ہوگا۔ یہ چھری لہو چاٹنے والی ہے۔ اس کا وار کب خالی گیا ہے۔

یہ خیال نہ کرنا۔ کہ گوشت کی بنی ہوئی آنکھ پر پلک ایک ننھا سا بال ہے۔ بابا یہ فتنی سینہ کے زخموں کے لیے بڑا ہی وبال ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں۔ اس کی ٹیڑھی نوک گرد و غبار کی ڈھال ہے آنکھ کے نازک فرش کو خاک دھول سے بچاتی ہے۔ ذرہ اُڑ کر آئے تو اپنی تخیلی ڈھال پر روک لیتی ہے۔

شاعر اس کو نیزہ کہتے ہیں۔ نیمچہ کا لقب دیتے ہیں۔ اور جن آنکھوں کی یہ پاسبان ہے۔ ان کو تیغ اور کٹاری کہہ کر پکارتے ہیں۔ بھوؤں کو کمان سے مشابہت دیتے ہیں جس کے تیر نظریں بیان کی جاتی ہیں۔

میں نہ ڈاکٹر نہ شاعر ایک معمولی دہقان ہوں، کھیت بوتا ہوں اور اس کے آس پاس کیکر اور بیری کے کانٹوں کی باڑ لگاتا ہوں۔ پس میرے خیال میں وہ پلک نہ نیمچہ ہے۔ نہ نیزہ اور آنکھ نہ تیغ ہے۔ نہ کٹاری۔ بلکہ کسومبہ کی کیاری ہے۔ جس کے آس پاس کانٹوں کی باڑ ہے تاکہ بے درد جانور ان مخمور سرخ پھولوں کو پامال نہ کر سکیں۔

میں اپنے کھیت میں آنسوؤں کا پانی دیتا ہوں۔ تو پھولوں کا منہ دھلا کر ان پلکوں کو بھی چھینٹا دیدیا کرتا ہوں۔ یہ بڑی ملنسار ہیں۔ تر ہو کر آپس میں مل جاتی ہیں۔

سنتا ہوں سرخ رنگ بہت مہنگا ہو گیا ہے۔ اور ڈرتا ہوں۔ کہ کوئی پٹواری میرے کسو مبی کھیت کا پتہ رنگ فروشوں کو نہ بتا وے۔ اور وہ پلکوں کی باڑ کے اندر گھس کر لال لال ڈوروں کے پھول نہ توڑ لیں۔ یا سرکار سے کہہ کر ان پر محصول نہ لگوا دیں۔ اسواسطے کہتا ہوں۔ کہ جو مادی رنگ کے لالچ سے اندر آئے گا ہاتھ خالی جائے گا میرے کھیت کے پھول دل کے باطنی کپڑوں کو رنگ سکتے ہیں۔ جس کو اس کی طلب ہو وہ آئے۔ دو آنسو جگر کی آہ میں رکھ کر نذر کرے۔ میں پلکوں کی باڑ ہٹا دونگا۔ اور اپنے گل لالہ کے رنگ سے اسے لالہ فام بنا دوں گا۔

افواہوں کے لطیفے

قیصرہ کے بچے کو سننے میں آتے ہیں

خدا کی مار اس کھوجڑے ہٹی لڑائی کو۔ ننے کے ابا کو خبر نہیں ہو کیا گیا ہے۔ کسی نے کچھ کھلا دیا ہے۔ یا کچھ کر دیا ہے۔ یا دشمنوں کے دماغ میں کچھ خلل آگیا ہے۔ لڑائی کے پیچھے ایسے ہاتھ دھو کے پڑے ہیں۔ کہ کسی ارمان ادہر سے خیال نہیں ہٹتا۔ لاکھوں عورتیں بیوہ ہو گئیں۔ بیشمار بچے یتیم ہو گئے۔ گھر بار جڑوں سے کھد گئے۔ لیکن ننے کے ابا کے سر سے لڑائی کا جن نہ اُترا نوج ایسے مردوے بھی کس کام کے۔ سمجھاتے سمجھاتے سر چکرا گیا۔ مگر ان کے کان پر جوں تک نہ چلی۔

خدا رکھے میرے جوان جہان لالوں کو خواہ مخواہ ساری دنیا کے کوسنے میں آتے ہیں بھاڑ میں جائے یہ بادشاہی۔ چولہے میں جائے یہ تخت و بخت۔ مجھے دو روکھی سوکھی روٹیاں بس ہیں۔ میں کُل گل کی بادشاہی ایک دم کو بھی نہیں چاہتی۔ میرے بچے جئیں جیا سو برس۔ بس یہی میری بادشاہی ہے۔

قیصرہ دل ہی دل میں یہ باتیں کر رہی تھی۔ کہ سامنے سے ولی عہد آتا دکھائی دیا۔ اور دور سے بولا۔ اماں اماں بھوک اماں روٹی۔

قیصرہ نے ولی عہد کی چٹ چٹ بلائیں لیں۔ اور کہا چلو بیٹا دسترخوان بچھا ہوا ہے۔ ذرا تمہارے باواجان کو بلالوں، سب مل کر کھانا کھائیں۔

ولی عہد نے ٹھنک کر کہا۔ نہیں بی بی ہمیں تو ابھی کھلادو۔ اباجی خبر نہیں کب تک آئیں گے وہ تو لڑائی کے کاغذ پڑھ رہے ہیں۔

ولی عہد کی بات پوری نہ ہوئی تھی۔ کہ قیصرہ کی چھوٹی لڑکی بسورتی ہوئی آئی۔ اور ماں کے لہنگے کو پکڑ کر کہا۔ اری بی بی سچ روٹی دوگی یا بھوکا ماروگی

قیصرہ بچوں کو لے کر دالان میں گئی۔ کھانے پر بٹھایا۔ اور لپکی ہوئی قیصر کے پاس پہنچی قیصر اس وقت اُپلوں کی دھونی رمائے ایک کھوپری سامنے رکھے کچھ منتر پڑھ رہا تھا۔ کالے ماش آگ میں ڈالتا جاتا تھا۔ اور سیندور کے ٹیکے کھوپری میں لگا رہا تھا۔

قیصرہ یہ تماشہ دیکھ کر پہلے تو بہت ڈری۔ مگر پھر ذرا جی کڑا کر کے بولی اے تم کیا کر رہے ہو۔ چلتے نہیں، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ قیصر نے ایک ہوں کی اور ہاتھ کے اشارے سے کہا تم چلو بچوں کو کھلاؤ میں ابھی آتا ہوں۔

قیصرہ بولی۔ بس ہوں ہاں ہو چکی لو ناچاری کو بلا چکے، دو نوالے چل کر کھاؤ۔ بچوں کو کھلاؤ۔ جو بھوک کے مارے بلبلائے جاتے ہیں۔

قیصر نے یہ سنکر تیوری چڑھائی اور زور سے دھتکارنے کی ایک ہوں کی۔

بچاری قیصرہ کانپ گئی۔ اور آنکھوں میں آنسو بھرے وہاں سے الٹی پھری۔ راستہ میں اس نے کہا۔ اے میری تو قسمت پھوٹ گئی۔ خدا کی سنوار اس موئے پادری کو جس نے اس دیوانے مجذوب سے میرا نکاح پڑھایا میں کیا جانتی تھی۔ کہ میری تقدیر پر ایسے پتھر پڑ جائیں گے یہ کہتی ہوئی دسترخوان پر آئی اور روٹی کا ٹکڑا توڑ کر کھانے لگی۔

اتنے میں قیصر بھی آیا۔ اور چپ چاپ کھانا کھانے لگا۔ قیصرہ سے بات کی نہ بچوں سے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد قیصرہ بولی۔

ے دیکھا میں تم سے ایک بات کہوں۔ اگر خفا نہ ہو پیر تو۔ تمہارے مزاج سے ناک میں دم
آگیا ہے۔ بات کہتے کلیجہ لرزتا ہے۔

قیصر نے گردن موڑ کر کہا۔ کہو کیا بکتی ہو منہ سے پھوٹ چکو۔ جو بکنا ہے بکو

قیصرہ سہم گئی اور کہا اسی واسطے تو میں تمہارے منہ نہیں لگتی۔ بات کہنا ظلم ہے اُٹھے
پہاڑ کھانے کو۔

قیصر نے نرمی سے کہا۔ کہو گی بھی آخر کیا بات ہے۔

قیصرہ نے کہا۔ بھی اس ہوڈن لڑائی کے واسطے کہتی تھی۔ میرا تو دم سناٹوں میں جاتا ہے
دیکھیے اس بھونچال کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اور تقدیر کیا کیا چکر دکھاتی ہے۔ تمہیں تو لڑائی بھڑائی
میں مزا آتا ہے۔ اور میرے بچے مفت میں کوسنے کھاتے ہیں۔

قیصر نے ابھی کچھ جواب نہ دیا تھا۔ کہ ولی عہد بولا۔ کہ ہاں ابا جی اماں سچ تو کہتی ہیں۔ آپ
ناحق دنیا میں خون خرابا کرتے ہیں۔ ساری دنیا سے آپ کیونکر جیت سکیں گے۔ خدا دیکھا نہیں
عقل سے پہچانا۔

قیصر یہ سنکر مسکرایا۔ اور اپنی جیب میں سے ایک بکس نکالا۔ اور اس کو کھولا جس کے
اندر ایک جزدان تھا۔ اس کو کھولا۔ تو ایک اور جزدان نکلا۔ اس کو کھولا تو تیسرا نکلا۔ غرض اسی طرح
سے سات جزدانوں کے اندر سے ایک آئینہ برآمد ہوا۔ قیصرہ نے اس آئینہ کو دھوپ کے رخ چمکایا
تو یکایک سامنے ایک باغ پیدا ہو گیا۔ قیصرہ اور ولی عہد اس باغ کو دیکھ کر حیران رہ گئے اس کے
بعد قیصر نے اس آئینہ کو پھر چمکایا۔ تو وہ باغ جلکر خاک ہو گیا۔

قیصر یہ تماشا دکھا کر بولا دیکھا میرے منتروں کو۔ جب یہ آئینہ میرے پاس ہے تو
میں کوسنے کاٹنے کی کیا پروا کروں۔ میرا کسی کے کوسنے سے بال بیکا نہ ہو گا۔

قیصرہ اور ولی عہد ششدر بنے کھڑے تھے اور کہتے تھے۔ کہ بے شک اس جادو کا
جواب دنیا میں کہیں نہیں۔

یہ آئینہ کی افواہ دلی میں بہت مشہور ہوئی تھی۔ اور اس کے اوپر کچھ اور حواشی بھی تھے جن کا لکھنا عبث تھا۔ لہٰذا صرف آئینہ کی افواہ پر میں نے دلی کی مستورات کے ولولہ کا رنگ چڑھا دیا۔ اور سمجھ لیا۔ کہ وہ قیصر جرمن و قیصرہ نہیں۔ دلی کے کوئی زرکوب یا زردوزوں کا خاندان ہوگا۔ جن کی حالت پر یہ خیال تصنیف کیا گیا۔ اور سننے والوں کو اس نے مزا دیا۔

عشق باز ٹڈہ

ہزاروں لاکھوں ننھی جان کے کیڑے پتنگوں میں ٹڈہ ایک بڑے جسم اور بڑی جان کا عشق باز ہے۔ اور پروانے کہتے ہیں۔ تو روشنی کے گرد طواف کرتے ہیں۔ بیقرار ہو ہو کر چمنی سے سر ٹکراتے ہیں ٹڈے کی شان نرالی ہے یہ گھورتا ہے، موچھوں کو بل دیتا ہے۔ اور اچک کر ایک حملہ کرتا ہے۔ سمجھتا ہوگا میں ٹکر مار کر روشنی کو فتح کر لونگا۔ سب کم ذات چھوٹے رقیبوں کی آنکھ میں خاک ڈال کر اپنی محبوبہ کو اُڑا کر لے جاؤں گا۔ اور آکھ کے درخت پر بیٹھ کر اس کو گلے لگاؤنگا۔ میرے گیت سن کر، روشنی ہمیشہ ہمیشہ کو میری تابعدار بن جاوے گی

پر ہائے عشق کے کوچہ میں کس کا خیال پورا ہوا ہے۔ کس کی آرزو بر آئی ہے، کون بامراد رہا ہے جو ٹڈے کا ارمان پورا ہوتا۔ حسرت نصیب اچک اچک کر، پھدک پھدک کر۔ گھور گھور کر رہ جاتا ہے۔ اور نور پر قبضہ میسر نہیں آتا۔

مجھ کو ان عاشق زار کیڑوں نے بہت ستایا ہے۔ میرے رات کے مطالعہ میں یہ شریر بڑا رخنہ ڈالتے ہیں۔ سر کے بالوں میں۔ آنکھوں میں۔ کانوں میں گھسے چلے آتے ہیں۔ کوئی پوچھے۔ کہ بھئی آدمی کے سر کیوں ہوتے ہو۔ جیسے آیا ہے۔ اس کے پاس جاؤ۔ اس سے ملنے کی کوشش کرو۔

مگر وہ تو زمانہ کی تاثیر ہے۔ آج کل ہر عشق باز باتوں اور لسان ہو گیا ہے۔ جان دینے اور معشوق پر قربان ہو جانے کی ہمت جانوروں تک میں نہیں۔ اب وہ وقت گیا جب شیخ سعدی

نے بلبل کو پروانہ کی سر فروشی کا طعنہ دیا تھا۔ اور کہا تھا۔ کہ عشق پروانہ سے سیکھ کہ ہوتا نہیں ایک دفعہ اگر جان دیدیتا ہے۔

اب تو پروانے ہی کتے ہیں تو آدمیوں کو ستاتے ہیں۔ ان کے ناک کان میں گھستے ہیں تاکہ وہ ان کی عشق بازی سے آگاہ ہوجائیں نمود کا شوق آدمیوں سے گذر کر جانوروں تک میں سرایت کر گیا۔ اندنوں ہر ہستی دکھاوے اور ریاکاری کی مشتاق ہے۔ یہ کیڑے صرف اپنے عشق کا اظہار کرنے کو آدمی پر گرے پڑتے ہیں۔ تاکہ اس کو علم ہوجاوے۔ کہ ان کو روشنی سے محبت ہے

ذرا انصاف کرنا کل میں نے مسہری کے پردے ڈال کر سرہانے روشنی رکھی۔ کہ اب تو ان نمودیے عشق بازوں سے چھٹکارا ملے گا۔ مگر ہوتی ننھے کیڑے مسہری کے چھوٹے سوراخوں میں گھس آئے۔ اور ایسی شورش کی۔ کہ میں نے کتاب اٹھا کر دے ماری۔ غصہ سے بیتاب ہوگیا۔ دیوانوں کیطرح کیڑوں کو۔ برسات کو اور اس موسم کی رات کو برا بھلا کہا۔

اور تو اور غسل خانہ تو الگ کونہ میں ہے۔ اس کے دروازہ پر تو چلمن پڑی ہوئی ہے۔ وہاں بھی ان فتنوں کی فوج گھستی چلی جاتی ہے۔ کیونکہ غسل خانہ میں بھی ان کی فاحشہ معشوقہ روشنی رکھی ہے

ٹپ کا سمندر

آج صبح جو میں نہانے کے لیے اندر گیا۔ تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ ایک سبز رنگ ٹڈا ٹپ میں تیر رہا ہے کہتا ہوگا۔ میں سمندر میں غوطے کھا کھا کرا ے جان تیری یاد کرتا ہوں۔ غارت کرے خدا تجھ کو اور تیری جان جاناں کو۔ میرے پانی کو گھناؤنا کردیا۔

دیکھو تو لمبے لمبے پاؤں پھیلائے ڈبکیاں کھاتا ہے۔ دم توڑتا ہے۔ مگر روشنی کی الفت کا دامن نہیں چھوڑتا۔

اس فطرت کو خدا کی سنوار اس کے ہاتھ میں کیا آتا ہے۔ برسات میں اس کثرت سے کیڑے کیوں پیدا کرتی ہے۔ اور ان کو عشق میں کیوں مبتلا کرتی ہے۔ اس کو کسی بشر کا بھی خیال ہے یا نہیں جو اشرف المخلوقات (؟)

ہے، جو رات کے چپ چاپ وقت کو اور فرصت و اطمینان کی گھڑیوں کو ان کم بخت کیڑوں کی بدولت مفت رائگاں کرتا ہے۔

اب صبح ہو گئی تب بھی چین نہیں۔ اور نہیں تو نہانے کے پانی میں اپنے جسم کا جہاز دوڑا رہے ہیں، یہ ساری کارستانیاں نیچر (فطرت) کی ہیں۔

آج سے مجھے کوئی مصور فطرت نہ کہنا۔ میں ایک آزار دہندہ فطرت کی تصویر کشی سے ہاتھ اٹھاتا ہوں، میرا اس نے ناک میں دم کر دیا ہے۔

ٹڈے صاحب ٹب کے سمندر میں جان دے رہے ہیں آرزو یہ ہے کہ مجنوںؔ فرہادؔ کے رجسٹر میں ان کا نام بھی لکھا جائے۔ ڈوب کر مرنے کا صلہ ان کو ہی ملے، ہرگز نہیں۔ میں تجھ کو مرنے ہی نہ دوں گا۔ زندہ نکال کر پھینکدوں گا۔ دیکھوں کیونکر ترا نام دفتر عشق میں لکھا جائے گا خیال تو کرو، حضرت کی صورت کیا سہانی ہے۔ چلبلی سا چہرہ۔ بال سی گردن، لمبا ناؤ سا بدن، اسپر ٹانگیں شیطان کی آنت جانور ہے، یا ہوّا ہے۔

فطرت صاحب کی عقل کے قربان جائیے۔ کیا بدشکل پرندہ بنایا ہے۔ میں فطرت ہوتا اور عشق باز جانوروں کو پیدا کرتا۔ تو بدن کے ہر حصہ کو سراپا درد و سوز بناتا جس کے دیکھتے ہی دیکھے ہوئے دل آہ آہ کرنے لگتے، جناب فطرت نے شکل بنائی ایسی۔ اور درد دیا عشق کا کیا وضع الشئی علی غیر محل کام کیا ہے۔

اُفوہ۔ بس۔ اب نہیں نہاتا، سقہ آئے تو تازہ پانی بھرواؤں، جب نہاؤں گا۔ اور اس عشق باز ٹڈے کی فریاد اردو ادب سے کروں گا،

جگر زخم کے ٹکڑے

کاغذ کی گرانی۔ ہندوستان میں جتنے کارخانے کاغذ بنانے کے ہیں وہ رات دن بیچاری کلوں کو چلاتے ہیں، پل بھر کا آرام انہیں نہیں لینے دیتے۔ گھانس اور گودڑ ڈھونڈتے پھرتے

ہیں جن سے کاغذ بنایا جاتا ہے۔ اس پر بھی پوری نہیں پڑتی کاغذ کا بھاؤ، دن بدن، گھڑی بگھڑی منٹ بہ منٹ سکنڈ بہ سکنڈ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ غریب اخبار والے رسالے والے۔ اور سب کاغذ چھاپ کر قومی، ملکی، اور ملکی خدمت کرنے والے حواس باختہ ہیں۔ بٹوہ سے روپے نوٹ نکال نکال کر دے رہے ہیں۔ اور کاغذی بس نہیں کرتے، کہتے ہیں اور لاؤ۔ کوئی کہے لالہ صاحب، میاں جی کے دل پر ہاتھ رکھ کر تو دیکھو۔ وہ کم بخت دھڑک رہا ہے۔ اور کاغذ کی گرانی سے سہما جاتا ہے۔ کاغذ کا بھاؤ یہی رہا یعنی اس کی تیزی بڑھتی رہی تو اخباروں اور رسالوں کا چھاپنا دوبھر ہو جائے گا۔ اور ضرورت جو ایجاد کی ماں کہلاتی ہے۔ حسب ذیل ایجادیں کرائے گی،

(۱) ہر دفتر اخبار کا ایک ایجنٹ ہر شہر میں مقرر ہو گا جس کو خبریں اور مضامین خط میں لکھ کر بھیج دیے جائیں گے۔ وہ سب خریداروں کے پاس جا جا کر مضامین اور خبریں سنایا کرے گا۔

(۲) کپڑے پر اخبار چھپیں گے،

(۳) کونسلوں میں آنریبل ممبر سوال کر کے گورنمنٹ سے یہ حق حاصل کریں گے۔ کہ گاؤں کے چوکیدار پٹواری، پوسٹماسٹر، اسکول ماسٹر۔ ڈاکٹر حکیم وید۔ امام، پیر، روزانہ ڈپٹی کمشنر بہادر کے ہاں حاضر ہوں۔ اور ان سے تازہ خبریں اور مضامین حاصل کر کے پبلک کو سنائیں اور جس قدر اخبارات و رسالے ہیں ان کے مالکوں کو جنگ کے کمیٹی سے راشن مل جایا کرے۔

دواؤں کی گرانی۔ ولایت کی بعض دوائیں اسقدر گراں ہو گئی ہیں جن کے سننے سے بخار چڑھ آئے۔ ایک روپیہ قیمت کے عوض بعض دوائیں۔ چالیس روپے تک پہنچ گئی ہیں۔ ولایت پر حصر نہیں، ہندوستان کی یونانی و ویدک ادویات کا بھی یہی عالم ہے مشہور دواخانہ ہندوستانی دہلی نے بھی سوائی ڈیوڑھی اور بعض دواؤں کی دوگنی تگنی قیمت کر دی ہے

ایسی حالت میں سوائے اس کے کچھ چارہ نہیں۔ کہ ملک کے نامور حکیم وید۔ ڈاکٹر جمع ہو کر علم مسمریزم سیکھ لیں۔ اور اس کے ذریعہ امراض کا علاج کریں یا وحشیانہ معالجات کا رواج جاری کیا جائے اور وہ داغنا۔ خون نکالنا ہے۔ کیونکہ ہر زمانہ میں تہذیب و وحشت کا اسی طرح سے مقابلہ ہوتا آیا ہے۔ کبھی تہذیب کا غلبہ ہوتا ہے۔ کبھی وحشت کا۔

کپڑے کی گرانی۔ روئی کٹ رہی ہے۔ سوت بنا جا رہا ہے۔ کلف تھانوں سے گلے مل رہی ہے۔ اسپر بھی خلل ہے۔ کہ کپڑے کا بھاؤ چڑھتا جاتا ہے۔ غریب لوگ ایسا مہنگا لباس نہیں خرید سکتے۔

کیا مضائقہ ہے۔ آدمی برہنہ پیدا ہوتا ہے۔ جس سے معلوم ہوا۔ کہ فطرتی اور نیچرل لباس برہنگی ہے۔ نیچر انسان کو ہمیشہ اصلیت کیطرف لاتی ہے۔ پس رفتہ رفتہ وہ مجبور ہو جائیگا اور اپنے مصنوعی لباسوں کو جو باعث تکلیف ہیں۔ خیرباد کہدے گا۔ یہ حالت اسیوقت کا پیش خیمہ ہے۔

ایمان کی گرانی۔ ہندوستان والے۔ ہندوستان والوں پر ڈاکے ڈالتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ ہم ملک کی خدمت کے واسطے روپیہ جمع کرتے ہیں۔ مگر اس اقتصادی مسئلہ پر غور نہیں کرتے۔ کہ امن میں ایمان ارزاں ہوتا ہے۔ اور بے امنی میں گراں انہوں نے جنس ایمان کو لوٹ مچا کر مہنگا کر دیا ہے۔ ایمان ہی ہاتھ نہ آیا۔ تو ملک کی ترقی کس کام آئے گی۔

مذاہب نے غدر، فساد، ڈاکہ زنی کو بہت معیوب قرار دیا ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں۔ اپنے دین و دھرم کے ایمان کی جڑ کاٹتے ہیں۔ یہ کھیتی نہ رہی تو ایمان اور بھی مہنگا ہو جائے گا۔

خوشی کی گرانی ساری زندگی کی بنیاد اطمینان اور خوشی پر ہے۔ آج کل یہ ساری دنیا میں گراں پائی جاتی ہے۔ سونے کی گنی پر چند آنے بڑھ گئے ہیں۔ اور خوشی کی نیند پر کروڑوں اشرفیوں کا اضافہ ہو گیا۔

بچے ہر قوم کے ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ اور کسی غم کو پاس نہیں آنے دیتے۔ مگر اس وقت

نے لاکھوں بچوں کی خوشی بھی چھین لی۔ لڑائی میں ان کے باپ مارے گئے۔ تب بھی وقت نے ان کو خوشی نہ دی۔ یعنی ان کو امن نہ اور مسافری کے جہازوں میں گولے مار کر ان بچوں کو ڈبو دیا

یہ وقت چھوٹی قیامت ہے۔ جہاں ماں باپ بچوں کو اور بچے ماں باپ کو اپنے غم میں بھول گئے ہیں۔

غم کی ارزانی۔ غم بہت سستا ہو گیا محرم آنے سے پہلے اس کو خرید کر گھروں میں بھر لینا چاہیے

عاشق مزاج تلاش غم میں سرگرداں پھرتے تھے۔ آج بازار دہر میں یہ جنس اتنی ارزاں ہے جس کی کچھ حد نہیں۔ کوئی ان کو خبر دیدے۔

غم اور فکر سنگدل آدمیوں کا قدرتی علاج ہے۔ بڑے بڑے سرکش فرعون غم دہر کے آگے سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ آج کل غم اتنا سستا ہے۔ کہ شاید دنیا سے کبر و نخوت دور ہونے کا وقت آیا ہے۔

بے حیائی کی ارزانی ہر چیز کی گرانی نے حیا فروش فرقہ کی ارزانی کر دی ہے یہ خطرناک ارزانی ہے۔ حکومت، سوسائٹی، اہل شریعت کو اس طرف جلدی متوجہ ہونا چاہیے ورنہ ارزانی پرست ہندوستان اس ڈاکو جماعت کے جال میں کثرت سے پھنس جائے گا۔

مکر و دغا کی ارزانی۔ ایمان کی گرانی کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ ہندوستان میں مکر و دغا کا مول گھٹ گیا۔ مکاری کو پالیسی اور عقلمندی کہتے ہیں۔ اور اعلےٰ درجہ والے بھی جو ہمیشہ صاف کھرے ہوا کرتے تھے۔ مذہبی منافق بنتے جاتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ۔ کہ اس کو جائز اور شان ہوشمندی سمجھتے ہیں۔ یہ ارزانی اصلاح اور روک تھام کے قابل ہے۔ ایسا نہ ہوا۔ تو مرض بے دوا اور لاعلاج ہو جائے گا۔

چپیلی ڈکار

کونسل کی ممبری نہیں چاہتا۔ قوم کی لیڈری نہیں مانگتا۔ ارل کا خطاب درکار نہیں موٹر، اور شملہ کی کسی کوٹھی کی ہمت نہیں۔ میں تو خدا سے، اور اگر کسی دوسرے میں دینے کی قدرت ہے تو اس سے بھی صرف ایک " ڈکار " طلب کرتا ہوں۔ چاہتا یہ ہوں۔ کہ اپنے طوفانی پیٹ کے بادلوں کو حلق میں بلاؤں اور پوری گرج کے ساتھ باہر برساؤں۔ یعنی کڑاکے دار ڈکار لوں۔ پر کیا کروں یہ نئے فیشن والے مجھ کو زور سے ڈکار لینے نہیں دیتے۔ کہتے ہیں۔ ڈکار آنے لگے۔ تو ہونٹوں کو بھینچ لو اور ناک کے نتھنوں سے اسے چپ چاپ اڑا دو۔ آواز سے ڈکار لینی بڑی بے تہذیبی ہے۔

مجھے یاد ہے۔ مسٹر جیمس لاتوش۔ یوپی کے لفٹنٹ گورنر علی گڑھ کے کالج میں مہمان تھے رات کھانے میں مجھ جیسے ایک گنوار نے میز پر زور سے ڈکار لے لی۔ سب جنٹلمین اس بچارے دہقانی کو نفرت سے دیکھنے لگے، برابر ایک شوخ وطرارفیشن ایبل تشریف فرما تھے۔ انہوں نے نظر حقارت سے ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ جیب سے گھڑی نکالی اور اس کو بغور دیکھنے لگے غریب ڈکاری پہلے ہی گھبرا گیا تھا۔ مجمع کی حالت سے متاثر ہو رہا تھا۔ برابر میں گھڑی دیکھی گئی تو اس نے بے اختیار ہو کر سوال کیا۔ جناب کیا وقت ہے۔

شریر فیشن پرست بولا گھڑی شاید غلط ہے اس میں نو بجے ہیں۔ مگر وقت بارہ بجے کا ہے کیونکہ ابھی توپ کی آواز آئی تھی۔

بے چارہ ڈکار لینے والا سن کر پانی پانی ہو گیا۔ کہ اس کی ڈکار کو توپ سے تشبیہہ دی گئی،

اس زمانے میں لوگوں کو سیلف گورمنٹ کی خواہش ہے۔ ہندوستانیوں کی عام مفلسی کی شکایت ہے۔ میں تو نہ وہ چاہتا ہوں۔ نہ اس کا شکوہ کرتا ہوں۔ مجھ کو تو انگریزی سرکار

رت آزاد ڈکار کی آرزو ہے۔ میں اس سے ادب سے مانگوں گا۔ خوشامد سے مانگوں گا۔ کوئی
ے گا۔ تو کہے دیتا ہوں زور سے مانگوں گا۔ جد و جہد کروں گا یا یجی ٹیشن مچاؤں گا۔ پرزور تقریریں
گا۔ کونسل میں جا کر سوالوں کی بوچھاڑ سے آنریبل ممبروں کا دم ناک میں کردوں گا

لوگو! میں نے تو بہت کوشش کی۔ کہ چپکے سے ڈکار لینے کی عادت ہو جائے ایک دن
ڈاوا اور پی کر اس بھونچالی ڈکار کو ناک سے نکالنا بھی چاہا تھا۔ مگر کم بخت دماغ میں الجھ کر رہ گئی
ہوں سے پانی نکلنے لگا۔ اور بڑی دیر تک کچھ سانس رکا رکا سا رہا۔

ذرا تو انصاف کرو۔ میرے ابا ڈکار زور سے لیتے تھے میری اماں کو بھی عادت تھی میں نے
دنیا کی ہم نشینی سے پہلے ہمیشہ زور ہی سے ڈکار لی۔ اب اس عادت کو کیونکر بدلوں۔ ڈکار
ہے۔ تو پیٹ پکڑ لیتا ہوں۔ آنکھیں مچکا مچکا کے زور لگاتا ہوں۔ کہ یہ موذی ناک میں آجائے
تو گیس بن کر نکل جائے۔ مگر ایسی بدذات ہے نہیں مانتی۔ حلق کو کھرچتی ہوئی منہ میں گھس آتی
اور ڈنکا بجا کر باہر نکلتی ہے۔

کیوں بھائیوں! تم میں سے کون کون میری حمایت کرے گا۔ اور نئی روشنی کی فیشن ایبل
سائٹی سے مجھ کو اس اکسٹریمسٹ حرکت کی اجازت دلوائے گا۔

خلقت تو مجھ کو حزب الاحرار یعنی گرم پارٹی میں تصور کرتی ہے۔ اور میرا یہ حال ہے۔ کہ
گرم ڈکار تک کو گرما گرمی اور آزادی سے کام میں نہیں لا سکتا۔ ٹھنڈی کرکے نکالنے پر مجبور
ں۔

ہائے میں پچھلے زمانہ میں کیوں نہ پیدا ہوا۔ خوب بے فکری سے ڈکاریں لیتا۔ ایسے وقت میں
ہوا ہے۔ کہ بات بات پر فیشن کی مہر لگی ہوئی ہے۔

تم نے میرا ساتھ نہ دیا۔ تو میں ماش کی دال کھانے والے بنیوں میں شامل ہو جاؤں گا
ے خوش قسمت لوگ ہیں۔ دکانوں پر بیٹھے ڈکاریں لیا کرتے ہیں۔ اپنا اپنا نصیبا ہے۔ ہم ترستے
ں۔ اور وہ نہایت مسرفانہ انداز سے ڈکاروں کو برابر خرچ کرتے رہتے ہیں۔ پیاری ڈکاریں کہاں

تک بکے جاؤں لکھنے سے کچھ حاصل نہیں ، صبر بڑی چیز ہے ۔

عید کی جوتی

جناب اکبر نے فرمایا تھا ۔ ڈاسن نے جوتا بنایا ۔ میں نے مضمون لکھا ۔ میرا مضمون نہ چلا اور جوتا چل گیا ۔

اب کوئی ان سے عرض کرے ، ولایتی جوتوں کے دام اتنے بڑھ گئے ہیں ۔ کہ ان کے پاؤں بھی لنگڑے ہوئے جاتے ہیں ۔

عید پر خلقت جوتے خریدنے جاتی تھی ، اور دو جوتیاں لاتی تھی ، جوتا مذکر ہے جوتی مونث ۔ لڑائی نے مرد ختم کر دیے ۔ عورتوں کو بڑھا دیا ۔ تو مذکر جوتے کیوں نہ کم ہوتے جوتیوں کا ڈھیر تھا ۔ مذکر جوتے ناپید تھے ،

ہائے میری پیاری دلی کی پیاری پیاری نازک اندام وصلی کی جوتی ۔ چشم بد دور خدا نے نصیبہ جگایا ۔ بارہ برس پیچھے دن پھرے ۔ دلی والوں نے اٹھا کر سر پر رکھا ۔

وصلی کی جوتی کی کیا بات ہے در حقیقت جوتی ہے کیسی بھولی بھالی ۔ کیسی ہر یالی منی ولایتی بوٹ کی طرح خرانٹ نہیں ۔ بیل شل نہیں ۔ دیکھنے میں دیدار و پہننے میں سکھ دینے ولایتی جوتوں کے دام پوچھو ۔ گیارہ روپے سے بھی کچھ اوپر ۔ اس جھجھماتی کی قیمت چار ، حد سے حد پانچ ۔ چھ ۔ دام کم ۔ کام بڑھیا ۔ پرانی ہو جائے تو آٹھ دس آنے کو الگ کر کے بک سکتی ہے ۔ مگر یہ بوٹ بگڑے پیچھے کوڑی کام کا نہیں ۔

ذرا نام پر بھی خیال کرنا ۔ وصلی ، ہائے وصلی میں وصال کا اشارہ ہے ۔ یعنی وصلی کی پہنو تو دام کم خرچ ہونگے اور دام کم خرچ ہونگے ۔ تو دل مطمئن رہیگا ۔ دل کا اطمینان وصال حقیقی ہے ۔ ولایتی جوتا موسمی اور فصلی جوتا ہے ۔ فصل جدائی کو بھی کہتے ہیں فصلی بخار کا نام بھی ہے ۔

صاحب ہم نے تو اس شعر کو دل دیا ہے ۔

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

لہٰذا عید پر جو تی بھی وہ لی جس کے نام میں وصل تھا۔ فصل سے دور ہی رہے۔ گو
بعد ایک فصلی بھی پڑے رہتے ہیں۔ مگر گفتگو تو جنت عید میں تھی۔

الُ گلہری

گلہری ایک موذی جانور ہے۔ چوہے کی صورت چوہے کی سیرت وہ بھی ایذا دہندہ۔ یہ بھی
...لی۔ چوہا بھورے رنگ کا خاکی لباس رکھتا ہے، تو جی وردی پہنتا ہے۔
گلہری کا رنگ چوہے کی راکھ کا سا ہے۔ پیٹھ پر چار لکیریں ہیں۔ جس کو لوگ کہتے ہیں
بی بی فاطمہ کا پنجا ہے۔ گلہری کی دم چوہے کے برخلاف ہے، چوہے کی دم پر بال نہیں
...کی دم گچھے دار ہے۔ گلہری کا سر چپٹا ہوتا ہے۔ چوہے اور اس کے سر میں تھوڑا ہی فرق
...دونو کا دماغ یکساں بنایا گیا ہے۔ چوہا بھی آدمیوں کی چیزیں خراب کرنے کی تجویزیں مغز
...ہے۔ اور گلہری بھی۔
...وہ منہ سے کھاتا ہے۔ اور اگلے ہاتھوں سے نوالہ اٹھا کر لے کترتا ہے۔ مگر گلہری کی
...نہیں۔ کبھی کبھی۔ اور گلہری تو ہمیشہ اوکڑوں بیٹھ جاتی ہے۔ ہاتھوں میں کھانے کی چیز
...دم ہلاتی جاتی ہے۔ تھرکتی ہے۔ پھدکتی ہے۔ اور کتر کتر کے کھانا کھاتی ہے
...یا بجا ر لوں میں موریوں میں میلے کچیلے سوراخوں میں گھر بناتا ہے۔ گلہری بڑی تمیز دار
...مکانوں کی چھتوں میں گھونسلا بناتی ہے۔ جس گھر میں ان جناب کا جی چاہا بے پوچھے
...تی ہیں۔ اور رضائی تو شک لحاف یا جو روئی دار چیز سامنے آئی اس کو کتر ڈالتی ہیں اس
...روئی نکالتی ہیں۔ اور اپنے گھر میں اس کے گدے بنا کر بچھاتی ہے۔ اور پھر نرم نرم بستر

...

رات بھر گھر کی مالک ہیں۔ صبح ہوئی اور یہ چل چل۔ چلل چلل۔ چل، چل، چل، چلل، چلل، چلل، چلل، چل چلل، چل، چلل، کبھی اپنی بولی میں خدا کی عبادت کرتی یا آدمی کو گالیاں دیتی ہوئی باہر نکل جاتی ہیں۔ سارا دن ہے۔ اور ان کا پیٹ ہے، جنگل پہنچتی ہیں پھل دار درختوں پر چڑھ جاتی ہیں اور خوب کھاتی پیتی ہیں، سڑکوں پر دوڑتی پھرتی ہیں۔ جہاں ذرا کھٹکا ہوا، اور انہوں نے دونو ہاتھ اونچے اٹھا کر چھاتی کے نیچے چپکے ہوتے ہیں اور پیروں کے بل کھڑے ہو کر ادھر ادھر گھبرا کر دیکھا، چل چل کی۔ دم کو ہلایا۔ کیونکہ انکی دم ہر چل کے ساتھ ٹھہر کرتی ہے۔ کوڑے کیطرح تڑپ کر بل کھاتی ہے۔ اور بھاگ گئیں گلہری کے بچے بھی چوہے کیطرح لال گوشت کی بوٹی ہوتے ہیں۔ ان پر بال نہیں ہوتے آنکھیں بند ہوتی ہیں، کچھ دن بعد بال نکلتے ہیں، آنکھیں کھلتی ہیں۔ اور دنیا میں غریب آدمی کے دوستانے والے اور بڑھ جاتے ہیں۔

میں نے اوپر کہا ال گلہری۔ عربی ال کو میں نے انگریزی دی کیطرح اس موذن سے الگ رکھا ہے۔ ملا دیتا تو گلہری کے کاٹنے کا ڈر تھا، بڑی شریر ہے، بڑی فتنہ ہے۔ میری بادشاہی ہو، تو سب سے پہلے گلہریوں کا قتل عام کراؤں۔ اور اس کے زن بچے کو لہو میں پلوا دوں

میری خوبصورت چھت گیری میں جگہ جگہ جھباتے لگا دیئے ہیں۔ لکڑی لے کر مارتا ہوں تو کیا مجال باہر نکل جائے۔ چھت گیری کے اندر دوڑتی پھرتی ہے۔ میں دوڑتا دوڑتا ہانپ جاتا ہوں، پسینہ سارے کپڑوں کو تر کر دیتا ہے۔ مگر یہ بے غیرت اچھلتی پھرتی ہے۔ ادھر سے ادھر ادھر سے ادھر

کونسل میں سوال

میرا ارادہ ہے، کہ کسی آنرایبل ممبر کونسل کو لکھوں۔ کہ آپ کے ال گلہری کی بابت بھی ایک سوال کریں جس کے الفاظ یہ ہوں۔

کیا گورنمنٹ کے علم میں یہ امر موجود ہے، کہ ہندوستان کی نہایت وفادار رعایا کو ایک موذی جانور گلہری نے بہت ستا رکھا ہے۔

گورنمنٹ کی وہ ساعی جمیلہ کونسل کو یاد ہیں جو عرصہ دراز سے چوہوں کے خلاف استعمال کی جاتی ہیں یعنی ان کو پکڑ کر ہلاک کر دینے کا پورا بندوبست کر دیا گیا ہے۔

لہٰذا میں نہایت ادب سے یہ مسودہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کہ ال گلہری کے مسئلہ پر بھی توجہ کیجائے اس جانور میں بھی پسو ہوتے ہیں۔ یہ بھی بیماریوں کی چھوت کو باہر سے گھر میں لاتی ہے۔ یہ بہت خطرناک معاملہ ہے۔ گورنمنٹ میونسپل کمیٹیوں کو ہدایت کرے کہ آیندہ گلہریاں ہر جگہ پکڑی جائیں۔ اور ہلاک کی جائیں۔

مفتیان ھند سے استفتاء

کیا فرماتے ہیں مفتیان دین بیچ اس مسئلہ کے کہ ایک گھریلو غیر پالتو جانور جس کو گلہری اور اس وقت ال گلہری بھی کہتے ہیں، متبرک و مقدس کتابوں کو کاٹ ڈالتا ہے اور صریحاً کتب مقدسہ کی توہین کرتا ہے۔ آیا ایسے بدذات حیوان پر جو پرندہ ہے اپنے دوڑے بھاگنے اور دیوار اور چھتوں پر پھرتی سے چڑھ جانے کے سبب اور درندہ ہے اپنے نوک دار دانتوں کے ناجائز استعمال کرنے میں موذی کا اطلاق عائد ہوتا ہے۔ یا نہیں اور قتل الموذی قبل الایذا کا حکم اس پر صادق آتا ہے یا نہیں بیّنوا توجروا

اے ال گلہری مجھے افسوس ہے۔ کہ تیرا نام اس مضمون کے لکھنے سے اردو ادب میں شامل ہو گیا۔ میں نہ چاہتا تھا۔ کہ تیرا ذکر ایک شیریں راحت جان زبان میں آئے۔ مگر کیا کروں۔ جیسا تو نے مجھ کو ستا کر بے بس کیا ہے ایسا ہی تیرا تذکرہ جبراً میرے قلم کے منہ میں آیا۔ اور چل چل کرتا نکل گیا۔

میری مقتول قمری

مجھ خاکی پتلے کی خاکسار خاکستری کُرتے والی لاڈلی قمری کو سفاک بلی نے قتل کر ڈالا۔ الٰہی اس بلی کو ہمیشہ جلتا بھنتا رکھیو۔ جس نے میری معصومہ کو پنجرے سے نکال کر چبا ڈالا۔ بلی بہت بُرا جانور ہے۔ حضرت اکبر الہ آبادی نے ایک شعر میں فرمایا تھا ؂

خواجہ حسن نظامی سے دِلّی نہ چھُٹ سکی
حضرت ابو ہریرہ سے بِلّی نہ چھُٹ سکی

آج مجھے بلی سے اس قدر نفرت ہے کہ اسکے ہم وزن قافیہ دلّی کو بھی چھوڑنے پر آمادہ ہو ں
موئی بلی۔ خاک میں ملی بلی تیرے ہاتھ کیا آیا۔ میری کم سخن قمری کو ہلاک کرنے سے تجھے کیا مل گیا۔ اس بیچاری میں گوشت ہی کتنا تھا۔ یاد الٰہی کرتے کرتے ہڈیوں کی مالا بن گئی تھی۔ ذرا دیکھو کیسی چوروں کی طرح آنکھ بچاتی۔ سہج سہج پاؤں دہرتی۔ دُم ہلاتی۔ پنجرے تک آئی اور کھڑکی پر ایسا پنجہ مارا کہ وہ کھل گئی اور پھڑ پھڑاتی ہوئی ننّھی سی جان کو نکال کرلے اُڑی ہائے قمری کی بے کسی ظالمن بلی مُنڈیا کو منہ میں دبا کر لے چلی اور اسکو پر ہلانے اور ٹھونگ مارنے کا بھی موقع نہ دیا۔

دیکھنا سارے صحن میں مقتولہ کے پر بکھرے پڑے ہیں۔ خدا نے اپنی عابدہ کو کیسا سہانا صوفیانہ لباس دیا تھا جسکو نامراد بلی نے اُتار ڈالا۔ اور پیروں میں روندنے کو راستہ میں ڈال گئی۔ للہ کسی مولوی صاحب کو خبر دو وہ اس پر کفر کا فتویٰ لگائیں۔ اس نے خدا کے عطیہ کی بڑی بے ادبی کی ہے۔

اری یہ طوطا نہ تھا مینا نہ تھی جو آدمیوں کو دنیا یاد دلاتے ہیں۔ یہ قمری تھی جو خدا کا نام یاد دلاتی تھی۔ اندہیرے سے اُٹھتی تھی۔ حق سرہ حق سرہ کہہ کر جگاتی اور کہتی اٹھو جاگو۔ اسکو یاد کرو۔ جس نے پیدا کیا ہے۔

بلے یہ تو وہ جانور ہی جسکو دنیا پرست منحوس کہتے ہیں اسکی آواز میں ویرانہ پن سمجھتے ہیں
بلی تو نے اسکو کیوں مارا - یہ تو میرے ویران دل کی آبادی تھی - میرے چپ چاپ
گھر کی رونق تھی - کسی اونچے محل میں گئی ہوتی - غفلت کی مستی میں سونے والوں کے
طوطے مینا کو مارا ہوتا - میری قمری کو مار ڈالا - میرے ٹوٹے دل کو اور اجاڑ ڈالا -
قمری مر گئی اُس کا قمرا پنجرے کے اندر نڈھال - خاموش بیٹھا ہی نہ کھاتا ہی نہ پیتا ہی سناٹے
میں ہی - روتا بھی نہیں ہنستا بھی نہیں - اسکو سمجھاؤ - دنیا فانی ہی - آنی جانی ہے -
قمری کا غم نہ کر - مرنے والی جان سے گئی اب وہ نہیں آسکتی تیرے ماتم سے کچھ نہ ہوگا
میرے دل میں تو جب آزادی کی محبت پھریری لیتی تھی تو ان قمریوں کی قید ناگوار
ہوتی تھی اور انکو آزاد کر دیتا تھا مگر ان سے اُڑا نہ جاتا تھا - اُڑتی تھیں اور گر پڑتی
تھیں اور زبان حال سے کہتی تھیں قید نے جسکے بازو شل کر دیے ہوں - اُس کو آزادی
دنیا بلی کے منہ میں دینا ہے -
میں پھر پکڑ کر پنجرے میں ڈال دیتا تھا - کیا خبر تھی - میرے جیل کے اندر بھی اس قاتلہ
بلی کا حملہ ہو سکتا ہی - میں قمریوں کی جان کا ذمہ دار تھا - خدا کو کیا جواب دوں گا جب
وہ مجھسے پوچھے گا کہ بے زبان جانور کو قید کر کے حفاظت نہ کی اور دشمن سے ہلاک کرا دیا
کہہ دوں گا - پروردگار تو جانتا ہی - دو برس تک اپنے پلنگ کے پاس رکھا اور بلی کے بیشمار
حملوں سے انکو بچایا - آج ذرا سے ذرا غافل ہوا تھا جو سانحہ عظیم پیش آگیا - اب تجھے
اختیار ہے جو چاہے سزا دے -

مسلم لیگ و کانگرس سے درخواست

کمال ادب و انکسار کے ساتھ میں اراکین مسلم لیگ و کانگرس اور اجازت مرحمت ہو
تو آنریبل ممبران کونسل سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ میری قمری کے لیے ایک
ماتمی ریزولیوشن اپنے جلسوں میں پاس کر دیں - کیونکہ یہ حادثہ ملیہ ہی - میں حق کہتا ہوں

کہ میری ملت اور ملک کے لوگ مجھ سے ہمدردی کریں۔

رائٹر ایجنسی کو چاہیے کہ وہ اس المناک خبر کا اعلان تمام دنیا میں کر دے کیونکہ اس خبر سے بڑھ کر کوئی خبر نہیں ہو سکتی جسمیں اسکی برابر غم و اندوہ ہو۔

قمری کا مزار

قلق اس کا ہو کہ بلّی نے قمری کی لاش بھی کہیں برباد کردی۔ ورنہ اُسکو سرو کے سایہ تلے دفناتا۔ اسکی آرزو بھی کہ ع۔ قدموں میں دلربا کے میرا مزار ہوتا۔ اور سرو اُس کا محبوب تھا مگر غریب کو بہت جلاتا تھا۔ جب ہی تو شاعر نے جل کر کہا تھا ؎

دل قمری کو جو اے سرو جلایا تو نے
یہ اثر ہے کہ ثمر تک بھی نہ پایا تو نے

قمری کا جنازہ دھوم سے اُٹھتا۔ پھولوں کی گلیوں سے ہو کر سایۂ سرو میں جاتا پھول بلبل سے کہتے تو اگر مرجائے تو ہماری گلی میں دفن ہونے آئے۔ مگر تو تو زندہ رہنے پر مرتا ہی بلبل اسپر رشک کرتا اور قمری کے جنازہ کو گلوں کی گلی سے نہ گزرنے دیتا مجکو اسکی خبر ہوتی تو میں حاکم دہلی کے پاس جاتا وہ مجکو پولس کی ایک جمعیت دیتے اور اسکے زور سے میں بلبل کی مزاحمت کو دور کرکے اپنی قمری کی میت سرو کے تلے دفن کردیتا اور سرہانے ایک تختی لگا دیتا جس پر مرقوم ہوتا:۔

ناشاد قمری کی تربت۔ جسکو جلاد بلّی نے مار ڈالا **۱۶ ۹ ۱ء** کی سب سے بڑی مصیبت کی یادگار میں یہ تختی لگائی گئی تاکہ سیاسیات اقتصادیات اور وہ تمام خشکیات جنکو رسالہ اسوہ حسنہ میرٹھ شائع کرتا ہے کچھ دن کے لیے دلوں کو مردہ کرنے سے باز رہیں۔ حسن نظامی

یہ تختی دیکھ کر ناظرین اور پبلشر و پرنٹر اسوہ حسنہ اینڈ پارٹی ناراض ہوتے اور میں اپنی قمری کا غم غلط کرنے کو اسپر ہنستا۔

حسن نظامی